حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی

ادارۃ المعارف کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کی وفات کے بعد ماہنامہ البلاغ کا ایک ضخیم خصوصی نمبر ۱۳۹۹ھ میں شائع کیا گیا۔ جس میں بہت سے اہلِ قلم نے حضرت قدس سرہ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر مقالات و مضامین لکھے۔

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب نے "حیات مفتیٔ اعظم" کے عنوان سے مفصل مقالا تحریر فرمایا تھا جس میں حضرت قدس سرہ کے خاندانی حالات، تعلیم و تعلّم، درس و تدریس، تالیف و تصنیف، بیعت و ارشاد وغیرہ کے مفصل تذکرے کے ضمن میں آپ کے اساتذہ و شیوخ اور متعلقین کا ذکر بھی اجمالاً و تفصیلاً حسین پیرائے میں بیان کردیا گیا ہے۔

بیعت و ارشاد کے ضمن میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سے آپ کے خصوصی تعلق کا ذکر مکتوبات کے ذریعہ بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ اسی طرح تحریک پاکستان میں حضرت مفتیٔ اعظمؒ کی شمولیت اور کارہائے نمایاں کو دلچسپ انداز میں تحریر کیا ہے۔ اس طرح شخصی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل یہ تحریر درحقیقت حضرت قدس سرہٗ کی مستقل سوانح حیات ہوگئی۔

احباب کے اصرار پر ان حضرات کے افادہ کے لئے جو البلاغ کا خصوصی نمبر حاصل نہیں کرسکے تھے "ادارۃ المعارف کراچی" نے الگ کتابی صورت میں شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ بارگاہ ایزدی میں دعا ہے کہ اس سعی کو قبول فرماکر قارئین کے لئے فائدہ مند بنائے اور اس کا نفع عام و تام فرمائے۔

والسلام

محمد مشتاق ستی

خادم ادارۃ المعارف کراچی

یکم محرم الحرام ۱۴۱۵ھ

۱۲ جون ۱۹۹۴ء

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ نمبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

والد ماجد، سیدی وسندی، مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی سوانح حیات لکھنے کا تقاضا دل میں عرصہ دراز سے تھا، حضرات اہل علم و قلم کا اصرار بھی مدت سے چل رہا تھا لیکن احقر اپنی نااہلی اور عدم استعداد کی بناء پر اس کام سے پہلو تہی کرتا رہا، کیونکہ ایسی عظیم اور ہمہ گیر شخصیت کے حالات زندگی لکھنے اور اس کے ہمہ پہلو کمالات اور گوناگوں کارناموں کو بیان کرنے کے لئے جس فہم و بصیرت، دقت نظر اور قدرت بیان کی ضرورت تھی۔ افسوس کہ احقر اس سے خالی ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے جب بھی کسی نے ان کے حالات زندگی لکھنے کا ذکر کیا تو سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی قابل رشک تواضع و انکساری سے نوازا تھا کہ لاکھ یقین دلانے کے باوجود وہ یہ باور کرنے کو تیار نہ تھے کہ ان کے حالات زندگی واقعی قابل تذکرہ ہیں، ان کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ :

"ہماری مثال ان حشرات الارض کی سی ہے جو روز پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں، کسی مکھی مچھر کی سوانح کون اور کیوں لکھے؟ ہم جیسے لوگوں کا تذکرہ اس سے زیادہ ممتاز نہیں بلکہ بزرگان سلف کے سوانح اور تذکروں کی قدر کم کر دینے کا سبب معلوم ہوتا ہے[1]۔"

۸۳-۱۳۸۲ھ کی بات ہے کہ حضرت والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ نے احقر کو فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی تبویب کا حکم دیا، اس کتاب کی ایک جلد "امداد المفتین" حضرت والد ماجد

---

[1] یہ والد صاحب کی تحریر "عرض حال" کا اقتباس ہے۔

رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ پر مشتمل ہے' احقر نے موقع غنیمت جان کر آپ کے مختصر حالات زندگی بھی تحریر کردیئے تاکہ اس جلد کے مقدمہ کے طور پر شائع کردیئے جائیں' ابتداءً تو آپ نے اس کو بھی ناپسند فرمایا' پھر کچھ حضرات کے اصرار پر طبعی انقباض کے باوجود بہت سی قطع وبرید کے بعد اجازت مرحمت فرمادی' مگر اس کے متعلق چند ارشادات بہ عنوان "عرض حال" تحریر فرما کر ساتھ شائع کرنے کا حکم دیا جو اس پیش لفظ کے بعد اب بھی شامل سوانح ہے' اس طرح آپ کے حالات زندگی پہلی بار ۱۳۸۳ھ میں آپ کی حیات ہی میں شائع ہوئے۔

اس مضمون کی اشاعت اول کے تقریباً پندرہ سال بعد اب جبکہ "مفتی اعظم نمبر" کی تیاری شروع ہوئی تو اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے کی نوبت آئی۔

مگر اب تو دنیا بدل چکی ہے' میرے مشفق والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ میرے صرف باپ ہی نہیں بلکہ میرے نکتہ رس مربی' میرے عظیم استاذ' میرے باریک بین شیخ' اور میری زندگی کے ہر پہلو میں ہادی و رہنما تھے' ان کی ذات گرامی میں میرے لئے نہ جانے کتنے سائے تھے جو ایک دم سر سے اٹھ گئے ہیں' ہر طرف دھوپ ہی دھوپ پھیلی نظر آتی ہے' زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ رنج و غم اور صدمہ کسے کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے صبر کا اتنا عظیم الشان اجر کیوں مقرر فرمایا ہے' ذمہ داریوں کا صحیح مفہوم بھی پہلی مرتبہ معلوم ہوا جن کے عجیب و غریب بوجھ سے آج کاندھے جھکے جھکے سے محسوس ہوتے ہیں' مسائل کے پہاڑ جو ان کی حیات میں ایک کھیل نظر آتے تھے آج انہیں دیکھ کر اعصاب کبھی ٹھٹھرنے لگتے اور کبھی ہل چل میں آجاتے ہیں۔

ایسے میں کوئی بھی تحریری کام آسان نہیں' خصوصیت سے حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی پر کچھ لکھنا پڑھنا ایسا کٹھن اور صبر آزما کام ہے کہ اس کے بیان کی بھی تاب نہیں۔ ادھر وقت کا تقاضا یہ ہے کہ مبسوط سوانح حیات لکھی جائے جس میں ان کے علمی' تحقیقی' تبلیغی اور سیاسی کارناموں کا مفصل بیان ہو' سبق آموز اخلاقی و روحانی کمالات کو واضح کیا جائے اور واقعات کی روشنی میں تعلیم و تربیت افتاء و تصنیف اور ملکی و اجتماعی معاملات میں ان کے مشفقانہ' حکیمانہ' محققانہ اور معتدل مسلک و مزاج کی تشریح کی جائے۔

آپ کی وفات کے وقت ناچیز کی عمر کا اکتالیسواں سال چل رہا تھا۔ یہ پورا عرصہ اللہ

تعالیٰ نے حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے زیر سایہ ہی نہیں بلکہ ان کی مشفقانہ و مربیانہ آغوش میں بسر کرایا، سفر و حضر میں اللہ تعالیٰ نے ان کی صحبت و معیت نصیب فرمائی اور کبھی ایک ڈیڑھ مہینے سے زیادہ جدائی کی نوبت نہ آئی۔ بغدادی قاعدہ سے لے کر دورہ حدیث تک بلکہ اس کے بعد تدریس و افتاء اور تمام علمی و دینی کاموں میں ان سے تلمذ و رہنمائی کا شرف حاصل رہا ۔ ان کے تمام کاموں اور مصروفیات میں ساتھ لگے رہنے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے کسی استحقاق اور اہلیت کے بغیر نصیب فرمائی، شادی کے بعد بھی احقر کو عیالداری کے باوجود ان کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہنے کی دولت آخر تک حاصل رہی، اس لئے ان کی مقدس زندگی کا کوئی گوشہ بحمد اللہ نظر سے پوشیدہ نہیں جس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر بجالاؤں کم ہے۔ ان کی جدوجہد سے بھرپور زندگی، متنوع اور ہمہ پہلو مصروفیات، ان کے شب و روز کے سبق آموز مشاغل، تفقہ و تدین اور تواضع و تقویٰ کے عظیم الشان کارنامے نظروں کے سامنے ہیں، تحریری یادداشتوں کا بھی بڑا ذخیرہ بحمد اللہ عرصہ سے جمع کرتا رہا ہوں مگر دماغ سن، دل شکستہ اور زبان و قلم گنگ ہیں۔

ادھر "مفتی اعظم نمبر" جس کی تکمیل میں پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی ہے اب کتابت کے بالکل آخری مراحل میں ہے، اس پر خرابئ صحت، دارالعلوم کی ذمہ داریاں اور ہجوم افکار مستزاد ہیں، ان حالات میں مفصل سوانح نگاری تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کب اور کس کے مقدر میں ہے تاہم "مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ" کے پیش نظر جتنا کچھ اور جیسا کچھ ہو سکا ہدیۂ قارئین ہے۔ اس مضمون میں ان حالات و واقعات کو زیادہ سے زیادہ سمونے کی کوشش کی ہے جو متفرق کاغذات اور یادداشتوں میں احقر کے پاس محفوظ تھے اور ابھی تک طبع نہیں ہوئے۔

امید ہے کہ اب یہ مضمون مفصل سوانح نگاری کے لئے کسی حد تک ٹھوس بنیاد فراہم کر سکے گا۔ اللہ تعالیٰ شرف قبول سے نوازے اور قارئین کے لئے نافع بنائے۔ آمین۔

عرض حال

جو حضرتؒ نے مقدمہ امداد المفتین کے آغاز میں تحریر فرمایا ——

سلف صالحین کے عہد میں سوانح حیات صرف ان قابل تقلید علماء صلحاء اور بزرگوں کی

لکھی جاتی تھی جو علمی مہارت و رسوخ اور صلاح و تقویٰ کی رو سے اہل عصر میں ممتاز سمجھے جاتے تھے اور بجا طور پر یہ دین اور علم دین کی اہم خدمت تھی جس پر بہت سے فوائد و مصالح کا انحصار تھا۔

لیکن آج کل دوسرے معاملات کی طرح سوانح نگاری بھی ایک صحافیانہ کاروبار بن کر رہ گیا ہے ہر شخص جس نے کسی ذریعہ سے کوئی شہرت حاصل کرلی' اس کی سوانح حیات لکھی جانے لگیں بلکہ خود اس کاروبار کو بھی ذریعہ شہرت کے طور پر استعمال کیا جانے لگا جس میں کئی قسم کی خرابیاں ہیں۔

(۱) جو لوگ علم و عمل اور اخلاق و کردار میں کوئی حقیقی مقام نہیں رکھتے' ان کی سوانح دیکھ کر عام مسلمان ایک مغالطہ کے شکار ہوں گے۔

(۲) اور جب روح اخلاص اور ضرورت دین پر بنیاد نہ رہی تو عموماً ان سوانح میں مبالغہ آمیزی اور غلط سلط روایات بھی ضرور ہوتی ہیں جو خود اپنے لئے گناہ اور عام لوگوں کے لئے مضر ہے۔

(۳) اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ موجودہ لوگوں کی سوانح حیات پڑھنے والے پچھلے بزرگوں کی سوانح حیات کو بھی اس پر قیاس کرکے ان کے فوائد و برکات سے محروم ہو جائیں گے۔ میرے لئے سخت حیرت و تعجب کی چیز ہے کہ بہت سے احباب اور کئی اداروں نے خود مجھ سے اس کی فرمائش کی کہ اس سلسلہ میں کچھ لکھ کروں' بعض نے اس سے مایوس ہو کر چاہا کہ وہ کچھ سوالات مجھ سے کرلیں اور پھر ان کے جوابات میں سے ایک سوانح تیار کرلیں مگر میرا جواب ان سب حضرات کے لئے یہ تھا کہ ہماری مثال ان حشرات الارض کی سی ہے جو روز پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں' کسی مکھی یا مچھر کی سوانح حیات کون اور کیوں لکھے' ہم جیسے لوگوں کا تذکرہ کچھ اس سے زیادہ ممتاز نہیں بلکہ بندگان سلف کے سوانح اور تذکروں کی قدر کم کردینے کا سبب معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت برخوردار مولوی محمد رفیع نے جو اوراق "ترجمۃ المصنف" کے عنوان سے لکھے' طبعی طور پر تو اس سے بھی شرم و ندامت محسوس کرتا ہوں مگر کچھ دوستوں کے اصرار پر اس میں آئے ہوئے کچھ بزرگوں کے مفید ارشادات اور علمی و اصلاحی فوائد کے پیش نظر اجازت دے دی۔ واللہ تعالیٰ اسأل العفو والعافیۃ

حضرت مفتی اعظمؒ کے آباء واجداد
اور
خاندان کے مختصر حالات

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم و علی آلہ وصحبہ ومن تبعھم

اجمعین ۔ امابعد

خاندان

والد ماجد سیدی وسندی مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور یوپی کے مشہور عثمانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں' آپ کی والدہ ماجدہ سادات میں سے تھیں اور آباء واجداد جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہیں' دیوبند کے ممتاز اہل علم تھے جو ہمیشہ علمی مشاغل میں مصروف اور اہل قصبہ ان کے معتقد رہے۔

سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ بن حضرت مولانا محمد یاسین صاحبؒ ابن خلیفہ تحسین علی صاحبؒ بن میاں جی امام علی صاحبؒ بن میاں جی حافظ کریم اللہ صاحبؒ ابن میاں جی خیراللہ بن میاں جی شکراللہ صاحبؒ[1]۔ افسوس کہ ان سے اوپر کے بزرگوں کے حالات معلوم نہیں ہوسکے حضرت والد بزرگوار قدس اللہ سرہ اپنے خاندان کے بارے میں خود فرماتے ہیں کہ :

"مجھے اپنے خاندان کا کوئی موثق اور باسند نسب نامہ ہاتھ نہیں آیا جس سے خاندان

---

[1] مقدمہ امداد المفتین اول کراچی صفحہ ۱۱

کے صحیح اور مستند حالات معلوم ہوتے مگر شریعت نے ان معاملات میں "سند متصل" ہونے کی شرط نہیں رکھی بلکہ بڑے بوڑھوں کی زبان پر عام شہرت کو کافی سمجھا ہے جس کو فقہاء کی اصطلاح میں "تسامع" کہا جاتا ہے۔ میں نے اپنے خاندان کے بزرگوں سے بہ تواتر یہ بات سنی ہے کہ ہمارا خاندان حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہے[۱]۔"

آباؤ اجداد کے جو حالات احقر نے حضرت والد بزرگوار رحمتہ اللہ علیہ سے سنے یا جو انہوں نے اپنے رسالے "میرے والد ماجد" میں بیان فرمائے ہیں یہاں ان کا خلاصہ ذکر کیا جاتا ہے۔

حافظ کریم اللہ صاحب

ہمارے خاندان کے جد امجد حافظ کریم اللہ صاحب کا اصل وطن قصبہ جوراسی تھا جو قصبہ منگلور کے پاس دیوبند سے تقریباً تیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ مغلی سلطنت کے زوال اور طوائف الملوکی کے دور میں قصبہ جوراسی کے ہندوؤں نے مسلمانوں پر مظالم کئے۔ حافظ کریم اللہ صاحب یہاں کے مسلمانوں کی فریاد لے کر نجیب الدولہ کے پاس نجیب آباد پہنچے۔ ان کی ریاست کی طرف سے ایک کمک پہنچی جس سے فتنہ دب گیا مگر جد امجد حافظ کریم اللہ صاحب کا دل یہاں کی حکومت سے اٹھ چکا تھا اس لئے مع اپنے خاندان کے دیوبند منتقل ہو گئے۔ دیوبند کے محلّہ "شاہ رمزالدین" کی مسجد میں لگے ہوئے ایک قطعہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۱۸۳ھ میں یہ بزرگ دیوبند منتقل ہو چکے تھے کیونکہ یہ فارسی قطعہ جو پتھر پر کندہ ہے حافظ کریم اللہ صاحب ہی کا ہے۔ اس کے دوسرے مصرعہ میں "خانہ حق' حق رمزالدین بود" ہے انہوں نے تاریخ ۱۱۸۳ھ نکالی ہے۔ اس وقت تک دارالعلوم دیوبند قائم نہیں ہوا تھا۔ اس کا قیام اس تاریخ کے ٹھیک ایک سو سال بعد ۱۲۸۳ھ میں عمل میں آیا۔

غرض حافظ کریم اللہ صاحب ہمارے خاندان کے پہلے بزرگ ہیں جو دیوبند منتقل ہوئے یہاں ان کی نسل ان کے صاحبزدے میاں جی امام صاحب سے چلی۔

---

[۱] دیکھئے حضرت رحمتہ اللہ علیہ کا رسالہ "میرے والد ماجد" ص ۶۔ اس رسالہ میں حضرتؒ نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد یاسین صاحب نور اللہ مرقدہ کے حالات ملفوظات اور ان کے مجرب عملیات تحریر فرمائے ہیں۔ کراچی سے طبع ہو چکا ہے۔

میاں جی امام علی صاحب

حضرت میاں جی امام علی صاحب زندگی بھر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی عمر اور تعلیم میں ایسی برکت عطا فرمائی کہ قصبہ دیوبند کا شاید ہی کوئی گھرانہ ہو جو ان کا شاگرد نہ ہو۔ اس لئے یہ بزرگ "میاں جی" کے لقب سے معروف ہوئے اور ان کی پہلی اولاد "خلیفہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔

لفظ میاں جی : ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصبات و دیہات میں پھیلے ہوئے عام مکاتب جن میں قرآن کریم کی تعلیم کے بعد اردو' فارسی' حساب' ریاضی کی تعلیم کا عام رواج تھا جو آج کل کے ہائی اسکول کی تعلیم سے زیادہ معیاری تعلیم تھی' اس کے ایسے اساتذہ "میاں جی" کے لقب سے معروف ہوتے تھے جو دینی تعلیم کے ساتھ عملی تقدس کے حامل ہوں جیسے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے شیخ "میاں جی نور محمد صاحب" بھی لوہاری میں معروف ہوئے اور میاں جی "منّے شاہ صاحب" دیوبند میں صاحب کشف و کرامات بزرگ ہوئے ہیں۔ حافظ کریم اللہ صاحب کی اولاد میں میاں جی امام علی صاحب کی بھی اسی طرح دیوبند میں عام شہرت ہوئی۔

میاں جی امام علی صاحب کے پانچ صاحبزادے تھے۔ جعفر علی[۱]' شجاعت علی[۲]' منیر علی[۳]' شبیر علی' تحسین علی[۵]۔

خلیفہ تحسین علی صاحب

میاں جی امام علی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دیوبند میں اچھی زمینداری عطا فرمائی تھی جو ان کے صاحبزادوں میں تقسیم ہوئی۔ صاحبزادوں میں سے اکثر تو سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے۔ خلیفہ تحسین علی صاحب آنکھوں سے معذور ہو جانے کے سبب کوئی ملازمت نہ کر سکے۔ زمین کا جو حصہ میراث میں ان کو ملا تھا اس پر تنگی کے ساتھ متوکلانہ گزارا تھا۔ بعد میں وقتی ضرورتوں سے مجبور ہو کر کچھ زمین بھی فروخت کرنا پڑی تو تنگدستی اور بڑھ گئی۔ آپ کے دو صاحبزادے تھے' حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ اور منشی منظور احمد صاحب۔

اولاد کو دینی تعلیم دلانے کا شوق بہت تھا۔ اپنے لائق فرزند حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ کو اول گھریلو مکتب میں قرآن مجید حفظ کرایا' پھر اسی مکتب میں اردو' فارسی' حساب' ریاضی کی مروّجہ تعلیم دلائی اور اب وہ اس قابل تھے کہ اپنے معذور والد کا ہاتھ بٹا سکیں لیکن معذور باپ نے فقروفاقہ کی زندگی اختیار کی اور ان کو دارالعلوم دیوبند میں اعلیٰ دینی عربی تعلیم کے لئے داخل کروایا۔ سعادت مند بیٹے نے بھی تعمیل حکم میں اس فقروفاقہ کی حالت میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔

حضرت مفتی اعظمؒ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ

حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمتہ اللہ علیہ احقر راقم الحروف کے جد امجد (دادا) ہیں' آپ کے دو صاحبزادے ہوئے۔ ایک احقر کے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور دوسرے "جناب محمد رفیع صاحب" جن کا انتقال کم عمری ہی میں ہو گیا تھا۔ تین بیٹیاں تھیں مگر نرینہ اولاد میں حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ ہی اکلوتے رہ گئے تھے' جن کے متعلق دادا جان مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ میرا ایک ہی بیٹا چار کے برابر ہے۔

حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب نور اللہ مرقدہ دارالعلوم دیوبند کے ہم عصر تھے۔ ان کی ولادت ۱۲۸۲ھ میں ہوئی جو ان کے تاریخی نام "افتخار" سے ظاہر ہے اور دارالعلوم دیوبند کا قیام ۱۲۸۳ھ میں ہوا۔ اس طرح ان کو دارالعلوم دیوبند کا قرن اول نصیب ہوا۔ فارسی ادب کی اعلیٰ تعلیم مولانا منفعت علی صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند سے حاصل کی جو مشہور شاعر غالب کے شاگرد تھے' عربی درس نظامی کی تعلیم دارالعلوم دیوبند کے قرنِ اول کے اکابر علماء سے حاصل کی جن میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ' مولانا سید احمد صاحب دہلویؒ' ملّا محمود صاحب دیوبندیؒ اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی رحمتہ اللہ علیہم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں بھی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے ان کو سب سے زیادہ مناسبت اور عقیدت ومحبت تھی' استفادہ بھی سب سے زیادہ ان ہی سے کیا۔

زمانۂ طالبعلمی کا ایک واقعہ : حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ نے طالبعلمی کا پورا زمانہ عسرت اور تنگدستی میں بسر کیا۔ ایکؒ روز آپ گرمی کی دوپہر میں دارالعلوم کے اسباق سے تھک تھکا کر چھٹی کے وقت گھر پہنچے تو والدہ نے آبدیدہ ہوکر اپنے لائق فرزند سے کہا۔ "بیٹا آج تو گھر میں کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے البتہ ہماری زمین میں گندم کی فصل تیار کھڑی ہے اگر تم اس میں سے کچھ گندم کاٹ لاؤ تو میں ان کو صاف کرکے آٹا پیس کر روٹی پکادوں گی۔" سعادت مند بیٹا محنت اور بھوک سے درماندہ اسی گرمی کی دوپہر میں اپنی زمین کی طرف چل دیا اور وہاں سے جس قدر بوجھ اٹھا سکتا تھا اتنے گندم کاٹ کرلے آیا۔ والدہ نے ان کو کوٹ کر چھان پیس کر آٹا بنایا اور روٹی پکائی۔ اس طرح ظہر کے وقت تک بھوک کا کچھ سامان ہوا۔ ظہر کے بعد اپنے اسباق کے لئے چلے گئے۔ ماں باپ اور بیٹے نے اسی فقروفاقہ میں وقت گذارا مگر تعلیم میں فرق نہ آنے دیا۔

بالآخر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ معذور والد بالکل ہی مجبور ہوگئے کہ اپنے ہونہار بیٹے کو کسی ملازمت پر لگا کر اپنی ضروریات حاصل کریں اور ایک جگہ جزوقتی ملازمت دلوادی اس کے نتیجے میں دارالعلوم کے اسباق کی حاضری میں کمی ہونا لازمی تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اس زمانہ میں ایک مقدس ولی اللہ صاحب کشف وکرامات بزرگ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ تھے جن کو درویشانہ زندگی کے باوجود اللہ تعالٰی نے دارالعلوم کے نظم ونسق کی بڑی صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ حضرت دادا صاحب کو چند روز تک دارالعلوم میں کم آتے دیکھا تو ایک روز بلا کر سبب پوچھا۔ سعادت مند طالب علم نے اپنی مجبوری اور ملازمت کا واقعہ بیان کیا۔ حضرت مہتمم صاحب نے فرمایا کہ زیادہ تو نہیں کچھ تھوڑا سا وظیفہ ہم تمہارے لئے جاری کرسکتے ہیں۔ اپنے والد صاحب سے پوچھو۔ اگر وہ اس پر قناعت کریں تو تمہاری تعلیم پوری ہوسکتی ہے۔

لائق بیٹے نے اپنے والد کو یہ پیغام دیا تو علم دین کے اس عاشق نے اسی قلیل وظیفہ پر فقروفاقہ میں بسر کرنے کو ترجیح دے کر ملازمت چھڑوادی۔ حضرت مہتمم صاحب اس وقت سے ان پر خصوصی شفقت وعنایت فرمانے لگے۔ ایک مرتبہ حدیث شریف کی تین کتابیں،

یہ واقعہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ نے اپنے رسالہ "میرے والد ماجد" میں بیان فرمایا ہے احقر نے زبانی بھی ان سے کئی بار سنا ہے (رفیع)

نسائی شریف، ترمذی شریف، ابن ماجہ شریف آپ کو عطا فرمائیں۔ یہ تینوں مقدس کتابیں حضرت مفتی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے ذاتی کتب خانہ میں آج بھی محفوظ ہیں۔ ان میں سنن نسائی پر حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی مہر بھی ثبت ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ نسخہ ان کے زیر درس رہا ہے۔ حضرت مولانا محمد لیٰسین صاحبؒ کے ہم درسوں میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم ہوئے اور حکیم عبدالوہاب صاحب جو "حکیم نابینا" کے لقب سے دہلی میں بہت معروف وباکمال طبیب ہوئے ہیں، بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ تعلیم سے غالباً[1] ۱۳۰۱ھ میں فراغت کے بعد اساتذہ اور بزرگوں کے ایما پر دارالعلوم دیوبند ہی میں باضابطہ تدریس کی خدمات میں مشغول ہو گئے۔

بیعت سلوک

حضرت مولانا محمد لیٰسین صاحب کو زمانہ طالب علمی ہی سے فقیہ العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ سے خاص محبت وعقیدت تھی۔ درس نظامی سے فراغت کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہوئے اور سلوک کی منازل طے کرنے لگے۔ یہ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی پیدائش سے تقریباً چودہ سال پہلے کا واقعہ ہے۔

حضرت دادا جان مرحوم کو دارالعلوم دیوبند کا کیسا قابل رشک دور نصیب ہوا تھا، اس کا کچھ اندازہ ان کے اس ارشاد سے ہوگا جو میں نے اپنے والد ماجدؒ سے بارہا سنا ہے کہ :

"ہم نے دارالعلوم کا وہ وقت دیکھا ہے جس میں صدر مدرس سے لے کر ادنیٰ مدرس تک اور مہتمم سے لے کر دربان اور چپراسی تک سب کے سب صاحب نسبت بزرگ اور اولیاء اللہ تھے، دارالعلوم اس زمانہ میں دن کو دارالعلوم اور رات کو خانقاہ معلوم ہوتا تھا کہ اکثر حجروں سے آخر شب میں تلاوت اور ذکر کی آوازیں سنائی دیتی تھیں[2]۔"

---

[1] رسالہ "والد ماجد" ص ۲۱

[2] رسالہ "میرے والد ماجد" ص ۵۲ طبع کراچی

آپ کا درس اور تلامذہ

حضرت دادا جانؒ دارالعلوم دیوبند کے شعبہ فارسی میں صدر مدرس تھے مگر خارج اوقات میں کچھ عربی کے اسباق بھی آخر حیات تک جاری رہے' فارسی درس کی انتہائی کتابیں نہایت شوق اور کامل تحقیق سے پڑھاتے تھے۔ ان کے یہ درس اتنے مقبول تھے کہ ان میں بعض فارغ التحصیل علماء بھی شریک ہوتے تھے۔ آپ کے درس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ طالب علم کے قلب میں ابتداء ہی سے اللہ تعالیٰ اور اس کے مقدس انبیاء علیہم السلام کی محبت اور بزرگان دین کی عقیدت جاگزیں ہو جاتی تھی' تدریس کا یہ سلسلہ چالیس برس سے زیادہ جاری رہا' دیوبند میں تعلیم یافتہ حضرات میں ایسے بہت کم لوگ تھے جو آپ کے حلقہ درس کے فیض یافتہ نہ ہوں اور بعض خاندانوں میں تو باپ بیٹا اور پوتا سب آپ کے شاگرد تھے۔ دور دراز ممالک سے آنے والے بہت سے طالب علم بھی تعلیم فارسی یا عربی میں آپ کے تلامذہ میں داخل ہیں۔ آپ کے ممتاز شاگردوں میں صاحب کشف و کرامات ولی اللہ حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحبؒ' شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمتہ اللہ علیہ مولانا محمد یٰسین صاحب شیر کوٹی اور اہل حدیث کے مشہور عالم دین مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

تصانیف

تدریسی مصروفیات کے ساتھ آپ کو کتب بینی اور تصنیف و تالیف کا بھی کسی قدر شغل ضرور رہتا تھا' ان اصلاحی و دینی مضامین کے علاوہ جو رسائل و اخبارات میں شائع ہوتے رہے آپ کی مندرجہ ذیل تصانیف بھی کافی مقبول ہوئیں۔

مفید نامہ جدید' جدید صفوۃ المصادر' مفید اصاغر و اکابر' رسالہ نادر' شرح صفوۃ المصادر' انشاء فارغ' یہ سب کتابیں فارسی کے طلباء کے لئے نہایت مفید ہیں' باربار طبع ہوئیں اور دارالعلوم دیوبند سمیت متعدد مدارس میں داخل نصاب رہیں۔

ذوق عبادت اور مرض وفات

اوراد و معمولات اور تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز باجماعت آپ کا شعار تھا' آخر عمر میں چند سال ضعف پیری کے ساتھ بہت سے امراض مسلسل لگے رہتے تھے' نشست و برخاست میں تکلف ہوتا تھا مگر جماعت کا وقت آتے ہی مسجد میں سب سے پہلے پہنچ جاتے تھے' مرض وفات میں دو ماہ تک ورم جگر اور کثرت اسہال کی شدید تکلیف اور بخار میں مبتلا رہے مگر لاٹھی کے سہارے مسجد میں پہنچتے رہے' جب اس کی بھی سکت نہ رہی تو مجبوراً ۵۶ دن کی نمازیں گھر ہی پر ادا کرنی پڑیں۔

اپنے لائق فرزند (حضرت مفتی صاحبؒ) سے ایک روز فرمانے لگے "شفیع" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں انہی دستوں میں ختم ہو جاؤں گا' مگر کچھ غم نہیں کیونکہ حدیث میں اس کو بھی شہادت فرمایا گیا ہے۔ شب جمعہ میں مغرب کے وقت حالت نازک اور بالکل نزع کا سا عالم تھا۔ ناچیز راقم الحروف کی محترمہ دادی جان نے والد ماجد سے فرمایا کہ اس وقت تم مسجد میں نہ جاؤ' نماز مغرب یہیں ادا کر لو مگر جماعت کے اس عاشق نے اسی نزع کی حالت میں فرمایا "نہیں مسجد" حضرت والد ماجد نے حکم کی تعمیل کی' جمعہ کو صبح صادق کے وقت والد صاحب کو اٹھایا کہ جلدی کرو میرے کپڑے اور بدن پاک کرنے ہیں' نماز قضا نہ ہو جائے' کپڑے اور بدن پاک ہونے کے بعد فرمایا "مجھے وضو کے لئے بٹھاؤ" والد ماجد نے اٹھایا تو معلوم ہوا کہ اعضا کی جان ختم ہو چکی ہے' اٹھاتے ہی آنکھیں چڑھ گئیں حالت بدل گئی' لٹا دیا گیا پھر کچھ سکون ہوا اور ذکر و توبہ واستغفار کرنے لگے پھر اچانک دادی جان سے فرمایا "رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم" اتنے الفاظ تو سنے گئے' اس کے بعد کوئی کلمہ ایسا فرمایا کہ "تشریف لائے" یا اس کے ہم معنی جو سمجھ میں نہیں آیا۔ نزع شروع ہو چکا تھا۔ کلمہ طیبہ پڑھتے رہے یہاں تک کہ آواز ختم ہو گئی مگر زبان کی حرکت باقی رہی' بالآخر چند منٹ میں ان سب حرکات کو ہمیشہ کے لئے سکون ہو گیا اور آپ کی اس دعا کی مقبولیت ظاہر ہو گئی جو اکثر پڑھا کرتے تھے کہ

جب دم واپسیں ہو یا اللہ! لب پر ہو لا الہ الا اللہ

آپ کی وفات دیوبند میں ۹ صفر المظفر ۱۳۵۵ھ کی صبح کو بروز جمعہ ہوئی' کل عمر تہتر سال

ہوئی۔ افسوس کہ ناچیز راقم الحروف کو دادا جان مرحوم کی زیارت نصیب نہیں ہوئی' کیونکہ میری ولادت ان کی وفات کے تقریباً پونے تین ماہ بعد جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ کی پہلی یا دوسری تاریخ کو ہوئی۔ وفات سے ایک دن پہلے احقر کے والد ماجدؒ سے فرمایا۔

"شفیع! بھول تو جایا ہی کرتے ہیں مگر اتنی بات کہتا ہوں کہ جلدی نہ بھول جانا"

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شدید تاثر کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ "ان کا یہ جملہ لوح قلب پر ایسا کندہ ہو گیا ہے کہ اب چالیس سال سے زائد ہو گئے ہیں' الحمدللہ کبھی فراموش نہیں ہوا۔" چنانچہ یہ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ گھر پر ہوں یا حالت سفر میں بلا ناغہ روزانہ تلاوت کر کے اور سال میں کئی بار فقراء و مساکین کو کھانا کھلا کر وہ اپنے والد بزرگوار کو ایصال ثواب فرماتے رہے۔ اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا۔

جد امجد کی وفات پر حضرت والد صاحبؒ نے ایک مرثیہ عربی میں اور ایک اردو میں کہا تھا۔ جو "کشکول" میں شائع ہو چکا ہے اور برادر عزیز مولوی محمد تقی عثمانی سلمہ کے مضمون "میرے والد میرے شیخؒ" میں بھی اس کے منتخب اشعار موجود ہیں۔

مفتی اعظمؒ کی والدہ ماجدہؒ

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ محترمہ سادات میں سے تھیں اور غالباً وہ بھی حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھیں' بیوہ ہو جانے کے بعد تاحیات اپنے سعادت مند بیٹے کے ساتھ رہیں' لکھنا پڑھنا نہ جانتی تھیں مگر نماز روزہ اور عبادت کا بڑا اہتمام فرماتی تھیں' ضروری کاموں سے فراغت کے بعد بیشتر وقت ذکر اور نماز میں یا نماز کے انتظار میں گزرتا تھا' سامنے گھڑی رکھی رہتی اور ان کی نظریں بار بار اسی کی طرف اٹھتی رہتی تھیں جب بینائی بہت کمزور ہو گئی تو ہم میں سے جو بھی سامنے سے گزرتا اس سے پوچھتی رہتیں "بیٹے کیا بجا ہے"؟ اذان میں کتنی دیر ہے؟ کثرت ذکر کی وجہ سے آخر حیات میں یہ حال ہو گیا تھا کہ باتیں کر رہی ہوں یا خاموش لیٹی ہوں' ہر سانس کے ساتھ اندر سے خود بخود "اللہ اللہ" کی آواز آتی رہتی تھی' جس کا احساس انہیں ہو یا نہ ہو' مگر ہم سب اہل خانہ ہمیشہ اس کا مشاہدہ کرتے تھے۔ ہم سب بچوں کو بزرگوں کے واقعات بڑے دلچسپ انداز میں سنایا کرتی تھیں' پاکستان تشریف لانے کے بعد بھی تقریباً گیارہ سال حیات رہیں۔ ۱۳۸۱ھ میں

انتقال ہوا۔ تاریخ وفات "مادر علامہ مفتی شفیع" نکالی گئی اور دار العلوم کراچی کورنگی کے قبرستان میں سب سے پہلی قبرانہی کی بنی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا آبائی وطن دیوبند ہے جو ضلع سہارنپور یوپی میں بر صغیر کا مشہور ترین قصبہ ہے' یہیں آپ کی ولادت ۱۳۱۴ھ میں شعبان کی تقریباً بیس تاریخ کو ہوئی' شمسی حساب سے یہ جنوری ۱۸۹۷ء تھا۔[1]

آپ کے دادا نے نام "محمد مبین" رکھا تھا لیکن آپ کے والد بزرگوار نے ولادت کی اطلاع کا خط اپنے شیخ حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کو لکھا تو حضرت گنگوہیؒ نے جواب میں نام "محمد شفیع" تجویز فرمایا خط کے الفاظ یہ ہیں:

"تولد فرزند سے مسرت ہوئی' نام اس کا محمد شفیع رکھنا"[2]

دیوبند

دیوبند کیا ہے؟ اس کے متعلق خود حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ اپنے رسالہ "نقوش و تاثرات[3]" میں فرماتے ہیں کہ:

"دیوبند کیا ہے؟ ایک چھوٹا سے قصبہ سہارنپور کا' جس کو نہ جغرافیائی اور عمرانی حیثیت سے کوئی خاص شہرت حاصل ہے نہ تجارتی یا صنعتی اعتبار سے' ہاں اس خوش نصیب خطۂ زمین میں علوم اسلامیہ کا ایک عظیم دار العلوم ہے جو ہندوستان میں اسلامی حکومت کے

---

[1] رسالہ "میرے والد ماجد" ص ۲۲۔ [2] حوالہ بالا

[3] ص ۱۰' ۱۱ اس رسالہ میں آپ نے پاکستان سے دیوبند و تھانہ بھون کا سفرنامہ اور وہاں کے سبق آموز تاثرات دلنشین انداز میں بیان فرمائے ہیں' کئی بار شائع ہو چکا ہے۔

سقوط کے بعد علوم اسلامیہ کو اپنے اصلی صورت میں باقی رکھنے کے لئے ایک گوشۂ خمول کی حیثیت میں قائم کیا گیا تھا' اللہ تعالیٰ نے اس کو حسن قبول عطا فرمایا اور مرکز علوم بنا دیا اور اس سے پیدا ہونے والے رجال اللہ اس آخری صدی کے مجدد ثابت ہوئے' اس طرح دیوبند اس دور انحطاط میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک پناہ گاہ بن گیا۔ دیوبند کا نام اسی دارالعلوم سے چمکا اور دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچا۔ یہ ادارہ دن میں علوم اسلامیہ کی ایک درسگاہ تھی' اور رات میں ذاکرو شاغل حضرات کی خانقاہ۔" آگے فرماتے ہیں:

"احقر نے اسی مبارک سرزمین پر آنکھ کھولی۔

بِلَادٌ بِهَا حَلَّ الشَّبَابُ تَمِيْمَتِیْ
وَاَوَّلُ اَرْضٍ مَسَّ جِلْدِیْ تُرَابُهَا[1]

اسی میں بچپن سے بچپن تک کے تمام ادوار زندگی طے کئے' میرا وطن کہنے کو تو دیوبند تھا' لیکن در حقیقت اس کا بھی ایک گوشہ یعنی "دارالعلوم" تھا' اسی میں طفلانہ کھیل کود کا وقت گزرا۔ اسی میں چھبیس سال تعلیم اور فتویٰ کی خدمت انجام دی[2]"

بچپن

حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے بزرگان دین کے ساتھ والہانہ عقیدت و محبت اپنے والد بزرگوار سے وراثت میں پائی تھی' کھیل کود کی نوبت کم ہی آتی تھی۔ آپ کی عادت تھی کہ جب بھی موقع ملتا' اپنے والد بزرگوار کے ساتھ اکابر علماء و صلحاء کی بابرکت مجلسوں میں جا بیٹھتے۔ شیخ الہندؒ حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ کی مجلس میں حاضری اکثر ہوا کرتی تھی۔

---

[1] یہ وہ شہر ہے جس میں شباب نے میرے گلے کے تعویذ کھولے اور یہی وہ پہلی سرزمین ہے۔ جس کی مٹی میرے بدن کو لگی۔

[2] نقوش و تاثرات ص ۱۱

آپ کے والد بزرگوار کی خواہش تھی کہ آپ کو قرآن شریف حفظ کرائیں، کچھ پارے حفظ کر بھی لئے تھی مگر جسمانی طور پر بچپن سے کمزور تھے، حفظ کی محنت برداشت نہ ہو سکی، مگر چند پارے، جو اس وقت حفظ کر لئے تھے عمر بھر ان کو یاد رکھنے کا اہتمام فرماتے تھے۔ آپ یہ پارے اکثر نفلوں اور تہجد میں پڑھا کرتے تھے۔ قرآن کریم کی تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم ہی میں خط و املاء کی مشق اور فارسی کی تمام مروّجہ کتابوں کی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی، حساب اور فنون ریاضی اقلیدس وغیرہ اپنے چچا جناب منشی منظور احمد صاحبؒ مدرس دارالعلوم دیوبند سے پڑھے اور فن تجوید اپنے عربی علوم کے رفیق درس جناب قاری محمد یوسف صاحب میرٹھی[1] سے (جو عرصہ دراز تک آل انڈیا ریڈیو سے تلاوت قرآن فرماتے رہے) حاصل کیا۔

عربی نحو و صرف اور فقہ کی ابتدائی کتابیں بھی فصول اکبری، ہدایۃ النحو، اور منیۃ المصلی تک اپنے والد موصوف سے فارسی تعلیم کے ساتھ ہی پڑھ لی تھی، اس طرح تعلیم قرآن کے بعد تقریباً پانچ سال فارسی، ریاضی وغیرہ کی پوری تعلیم اور عربی کی ابتدائی کتب میں صرف ہوئے۔

درس نظامی اور آپ کے اساتذہ

۱۳۳۰ھ میں جب آپ کی عمر سولہ سال تھی، اصول فقہ اور ادب وغیرہ کی متوسط کتابیں دارالعلوم دیوبند کے درجہ عربی میں باقاعدہ داخل ہو کر شروع فرمائیں۔

آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس میں ہر طرف علم و عرفان اور زہد و تقویٰ کے وہ بے مثل پہاڑ تھے جن کی رگ رگ سے علوم و معارف کے بے شمار چشمے نکل کر عالم اسلام کو سیراب کر رہے تھے، اس روح افزا ماحول میں آپ نے جن یکتائے روزگار اساتذہ سے استفادہ کیا، ان کو اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کا جنید، کرخی، ابن حجر اور رازی اور غزالی بنایا تھا، آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ:

---

[1] موصوف کا انتقال کراچی میں ۱۳۹۰ھ میں ہوا۔ دارالعلوم کراچی کے قبرستان میں آپ کا مزار ہے۔

بچپن کا ایک واقعہ

والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے بچپن کا یہ واقعہ کئی بار مجلسوں اور مواعظ میں سنایا کہ ایک مرتبہ میں اور میرے رشتہ کے بھائی عاقل صاحب سرکنڈوں سے کھیل رہے تھے۔ بھائی عاقل مجھ سے بڑے تھے' انہوں نے میرے سارے سرکنڈے جیت لئے۔ مجھے اتنا شدید غم ہوا کہ آج تک یاد ہے' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ سے زیادہ کوئی مظلوم نہیں' بالکل لُٹ گیا ہوں۔ پھر فرمایا کہ آج وہ واقعہ یاد کرکے ہنسی آتی ہے کہ سرکنڈے جیسی حقیر چیز کی کتنی وقعت و محبت دل میں تھی کہ سرکنڈے جیت لئے تو مالا مال' ہار گئے تو گویا لٹ گئے پھر فرمایا کہ آخرت میں بھی ہمارا یہی حال ہوگا کہ جنت کی نعمتوں کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمتیں ہیچ نظر آئیں گی اور ہم اپنی اس نادانی پر ہنسا کریں گے کہ بھلا دنیا کی حکومت و اقتدار' مال و دولت' جائداد اور ساز و سامان بھی اس قابل چیزیں تھیں کہ ہم ان کو دل میں ذرا بھی جگہ دیتے ہم کیسے نادان تھے کہ ان کے لئے لڑتے جھگڑتے تھے۔

ابتدائی تعلیم

پانچ سال کی عمر میں قرآن کریم ناظرہ کی تعلیم جناب حافظ محمد عظیم صاحب کے پاس دارالعلوم دیوبند میں شروع فرمائی' حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی ننھیال قاضی پور ضلع مظفر نگر میں تھی۔ بچپن میں اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ وہاں بکثرت جانا ہوتا تھا' ایک مرتبہ جب آپ قرآن شریف غالباً ناظرہ ہی پڑھتے تھے وہاں کچھ زیادہ دنوں کے لئے جانا ہوا تو تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے آپ کو وہیں کے ایک مکتب میں عارضی طور پر بٹھا دیا گیا' طبیعت میں لطافت بچپن سے تھی۔ دیہاتی مکتب کا ماحول اور اسی مزاج کے استاذ کا انداز تعلیم سخت اجنبی اور صبر آزما تھا' بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ یہاں کی روزمرہ میں داخل تھی اور مار پٹائی صبح شام کا مشغلہ۔ آپ کو ایسے ہولناک مناظر سے کہاں واسطہ پڑا تھا' ایک روز استاذ نے کسی بچہ کو رسی سے باندھ کر ڈنڈے سے مارا تو آپ فرماتے تھے کہ مجھے یہ دیکھ کر ہی دہشت سے تیز بخار چڑھ گیا' جب والدہ کو معلوم ہوا تو مجھے اس مکتب سے اٹھا لیا گیا۔ غرض قرآن شریف کی ناظرہ تعلیم بھی دارالعلوم دیوبند ہی میں ہوئی۔

آپ کے والد بزرگوار کی خواہش تھی کہ آپ کو قرآن شریف حفظ کرائیں، کچھ پارے حفظ کر بھی لئے تھی مگر جسمانی طور پر بچپن سے کمزور تھے، حفظ کی محنت برداشت نہ ہو سکی، مگر چند پارے، جو اس وقت حفظ کر لئے تھے عمر بھر ان کو یاد رکھنے کا اہتمام فرماتے تھے۔ آپ یہ پارے اکثر نفلوں اور تہجد میں پڑھا کرتے تھے۔ قرآن کریم کی تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم ہی میں خط و املاء کی مشق اور فارسی کی تمام مروّجہ کتابوں کی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی، حساب اور فنون ریاضی اقلیدس وغیرہ اپنے چچا جناب منشی منظور احمد صاحبؒ مدرس دارالعلوم دیوبند سے پڑھے اور فن تجوید اپنے عربی علوم کے رفیق درس جناب قاری محمد یوسف صاحب میرٹھیؒ[1] سے (جو عرصہ دراز تک آل انڈیا ریڈیو سے تلاوت قرآن فرماتے رہے) حاصل کیا۔

عربی نحو و صرف اور فقہ کی ابتدائی کتابیں بھی فصول اکبری، ہدایۃ النحو، اور منیۃ المصلی تک اپنے والد موصوف سے فارسی تعلیم کے ساتھ ہی پڑھ لی تھی، اس طرح تعلیم قرآن کے بعد تقریباً پانچ سال فارسی، ریاضی وغیرہ کی پوری تعلیم اور عربی کی ابتدائی کتب میں صرف ہوئے۔

درس نظامی اور آپ کے اساتذہ

۱۳۳۰ھ میں جب آپ کی عمر سولہ سال تھی، اصول فقہ اور ادب وغیرہ کی متوسط کتابیں دارالعلوم دیوبند کے درجہ عربی میں باقاعدہ داخل ہو کر شروع فرمائیں۔

آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس میں ہر طرف علم و عرفان اور زہد و تقویٰ کے وہ بے مثل پہاڑ تھے جن کی رگ رگ سے علوم و معارف کے بے شمار چشمے نکل کر عالم اسلام کو سیراب کر رہے تھے، اس روح افزا ماحول میں آپ نے جن یکتائے روزگار اساتذہ سے استفادہ کیا، ان کو اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کا جنید، کرخی، ابن حجر اور رازی اور غزالی بنایا تھا آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ:

---

[1] موصوف کا انتقال کراچی میں ۱۳۹۰ھ میں ہوا۔ دارالعلوم کراچی کے قبرستان میں آپ کا مزار ہے۔

"اگر ہم اپنے بزرگوں کے تبحر علمی اور باطنی کمالات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ نہ کرتے تو ہمیں اپنے قدیم اسلاف، تابعین، تبع تابعین کے حیرت ناک دینی کمالات کا مشاہداتی علم نہ ہو سکتا۔"

حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات نے اپنے کمال علم اور پختگی کردار سے قرون اولیٰ کی وہ داستانیں تازہ کردی تھیں جن پر تاریخ انسانی ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔ آپ کے اساتذہ کرام میں یہ حضرات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

(۱) فخر المحدثین[۱] حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمتہ اللہ علیہ۔

(۲) مفتی[۲] اعظم ہند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ دیوبند (صاحب عزیز الفتاویٰ)

(۳) سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد احمد صاحب ابن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ۔

(۴) شیخ[۳] الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی رحمتہ اللہ علیہ

(۵) عارف[۴] باللہ حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحب رحمتہ اللہ علیہ

---

[۱] ولادت ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ وفات ۲ صفر ۱۳۵۲ھ موصوف کی جامع تاریخ حیات "نفحۃ العنبر" بزبان عربی مجلس علمی ڈابھیل سے اور مختصر سوانح "حیات انور" کے نام سے اردو میں دیوبند سے شائع ہو چکی ہے۔

[۲] تاریخی نام ظفر الدین ہے (ولادت ۱۲۷۵ھ وفات ۱۷ جمادی الثانیہ ۱۳۴۷ھ) مفصل تذکرہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کے طویل پیش لفظ میں خود حضرت والد ماجدؒ نے تحریر فرمایا ہے (رفیع)

[۳] مختصر تذکرہ بنام "حیات شیخ الاسلام" ادارۂ سیرت پاکستان لاہور سے اور تفصیلی حالات بنام "تجلیات عثمانی" ادارہ نشر المعارف چہلیک ملتان سے شائع ہو چکے ہیں۔ (ولادت عاشورہ محرم ۱۳۰۵ھ وفات ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء پاکستان)

[۴] دارالعلوم دیوبند کے مشہور محدث، تقویٰ و طہارت اور عبادت و تقدس کے پیکر، عربی و اردو کی نہایت مفید کتابوں کے مصنف (وفات ۱۳۶۴ھ مقام راندیر، ضلع سورت) مختصر سوانح بنام "حیات اصغر" دیوبند سے شائع ہو چکی ہے۔

(۶) شیخ الادب[1] حضرت مولانا اعزاز علی صاحب قدس اللہ سرہ
(۷) جامع المعقول والمنقول حضرت مولانا رسول خاں[2] صاحب رحمۃ اللہ علیہ
(۸) حضرت مولانا محمد ابراہیم[3] صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ

افسوس کہ یہ سب حضرات دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں' اول الذکر تین بزرگوں کی زیارت احقر کو نصیب نہیں ہوئی' البتہ باقی سب اساتذہ کی نہ صرف زیارت نصیب ہوئی بلکہ حضرت والد ماجدؒ کے طفیل ان سب حضرات کی عنایات اور شفقتیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائیں۔ فالحمدللہ علی ذالک

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بزرگوں اور اساتذہ کو آپ سے کتنا تعلق تھا۔ اس کا کچھ اندازہ اس مضمون سے ہو گا جو برادر عزیز مولانا محمد تقی صاحب عثمانی (کثر اللہ امثالہ) نے "حضرتؒ کے شیوخ و اکابر" کے عنوان سے البلاغ کے مفتی اعظم نمبر کے لئے لکھا ہے۔

طلب علم میں انہماک

علمی ذوق آپ کی زندگی کے ہر شعبہ پر ہمیشہ غالب رہا' زمانہ طالب علمی میں آپ جس انہماک اور جانفشانی سے اپنے اسباق کی طرف ہمہ تن متوجہ رہے اس کی مثالیں دور حاضر میں نایاب ہیں۔ عربی تعلیم باقاعدہ شروع فرمانے کے وقت سے دارالعلوم ہی گویا آپ کا گھر تھا' اسباق سے فارغ ہو کر اپنے ہم سبقوں کو روزانہ کے اسباق کا اس طرح تکرار (اعادہ) کراتے تھے کہ استاذ کی تقریر کا پورا چربہ اتر جاتا تھا' آپ کا تکرار طلبہ میں بہت مقبول تھا۔ طلباء اتنی اہمیت سے اس تکرار میں شریک ہوتے کہ مستقل ایک درس کی سی صورت بن

---

[1] سوانح حیات بنام "تذکرہ اعزاز" دیوبند سے شائع ہوئی ہے۔ دیوبند کے اکابر اساتذہ میں ممتاز اور فقہ و ادب میں کئی درسی کتابوں اور بہت سے نہایت مفید اور وقیع حواشی کے مصنف ہیں۔

[2] تقسیم ہند کے بعد بھی جامعہ اشرفیہ لاہور میں تاحیات آپ کا درس جاری رہا۔ یہیں وفات ہوئی' آپ کا تذکرہ حال ہی میں قاری فیوض الرحمٰن صاحب (ایبٹ آباد) نے لکھا ہے۔

[3] تاحیات دارالعلوم دیوبند میں مدرس رہے۔ علوم عقلیہ میں امام سمجھے جاتے تھے۔

جاتی، حضرتؒ نے ایک مرتبہ طلبہ دارالعلوم کراچی کو جن میں راقم الحروف بھی موجود تھا، تکرار کی تاکید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

"میں مقامات کے تکرار میں شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کی پوری تقریر کا اعادہ اسی ترتیب سے کیا کرتا تھا جس طرح استاذ محترم نے بیان کی تھی۔ بعض اوقات استاذ محترم میری لاعلمی میں میرا تکرار سنتے اور مجھے بعد میں پتہ چلتا کہ وہ سن کر بہت خوش ہوئے ہیں۔

اکثر صبح کو دارالعلوم جا کر رات ہی کو واپسی ہوتی اور بعض اوقات رات کو بھی وہیں مولسری کے درخت کے نیچے کھلے فرش پر سو جاتے۔ تکرار عموماً رات کو ہوتا تھا اور جب گھر واپسی ہوتی تو کبھی رات کا ایک بج جاتا کبھی دو۔ حضرتؒ نے دارالعلوم کراچی کے طلبہ کو ایک مرتبہ نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"رات کو والدہ میرا انتظار کرتی تھیں کہ کھانا گرم کر کے دیں، ان کے انتظار میں مجھے تکلیف ہوتی تھی، بڑی منت سماجت سے اس پر راضی کیا کہ میرا کھانا ایک جگہ رکھ دیا کریں۔ سردیوں کی راتوں میں شوربہ اوپر سے بالکل جم جاتا اور نیچے صرف پانی رہ جاتا۔ میں وہی کھا کر سو جایا کرتا۔"

دیوبند آپ کا وطن تھا اور تمام اعزہ و اقارب کے گھر یہیں تھے لیکن طالب علمی میں ان کے یہاں جانے کا وقت بھی نہ ملتا، نہ محلے کے ہم عصر لڑکوں سے دوستانہ تعلقات کی نوبت آئی، حتیٰ کہ آپ کو دیوبند کے جو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے تمام راستے بھی بخوبی معلوم نہ تھے۔ تعلیمی انہماک کے باعث کسی اور کام کی فرصت ہی نہ تھی۔ جب کچھ وقت ملتا، حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں جا بیٹھتے، آپ کی ذہانت علمی ذوق و شوق اور صلاح و تقویٰ کے باعث آپ کے اساتذہ کی مشفقانہ توجہ ہمیشہ آپ پر مرکوز رہی۔

ایک مرتبہ حضرت نانوتویؒ کے مخصوص شاگرد و مرید اور مدرسہ عبدالرب دہلی کے بانی حضرت مولانا عبدالعلی صاحب دارالعلوم تشریف لائے۔ معزز مہمان اور دوسرے اساتذہ کرام کے ساتھ دارالعلوم کے اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کھڑے تھے۔ قریب سے حضرت والد صاحب بغل میں کتابیں دبائے گزرنے لگے تو مہتمم صاحب نے بلا لیا اور معزز مہمان سے فرمایا:

"یہ دارالعلوم کا ایسا طالب علم ہے کہ اسے اپنی کتابوں کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں' نہ اپنے کپڑوں کی خبر ہے' نہ جان کی' کتاب کا کوئی سوال پوچھو تو محققانہ جواب دے گا۔"

مولانا عبدالعلی صاحبؒ نے دیکھتے ہی فرمایا "یہ تو مولوی محمد یٰسین صاحب کا لڑکا معلوم ہوتا ہے۔" مولانا کا قیافہ مشہور تھا۔

ایک مرتبہ شرح جامی کا امتحان شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کے پاس تھا۔ اس وقت تک آپ نے کوئی کتاب مولانا سے نہیں پڑھی تھی' تحریر سے نہ پہچان سکے' آپ کا نہایت ممتاز اور محققانہ پرچہ دیکھ کر حیرت و مسرت ضبط نہ کر سکے' پرچہ لے کر فوراً مہتمم صاحب کے پاس آئے اور پوچھا یہ کون طالب علم ہے اس نے تو اس کتاب کی شرح تصنیف کر دی ہے۔ یہ سنتے ہی مہتمم صاحب فرط مسرت سے امتحان گاہ تشریف لائے' حضرت والد صاحب اس وقت کسی اور امتحان کا پرچہ لکھ رہے تھے۔ آپ کو بلا کر تمام طلبہ کے سامنے کھڑا کیا اور آپ کے سر پر ہاتھ رکھ کر پرچہ کی غیر معمولی خوبی کا اعلان فرمایا۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے پہلی ملاقات

آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے ہم سبق تھے لیکن حضرت گنگوہیؒ کی وفات کے بعد انہی کو اپنے شیخ کا قائم مقام سمجھتے اور ہر شعبان کے اواخر میں ان کی زیارت کے لئے تھانہ بھون تشریف لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ۱۳۲۳ھ میں آپ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے' یہ حضرت تھانویؒ سے آپ کی پہلی ملاقات تھی' جو نو سال کی عمر میں ہوئی۔

دوسری ملاقات اور یونانی فلسفہ پڑھنے کے لئے مشورہ

حضرت تھانویؒ کی خدمت میں آپ کی دوسری حاضری زمانہ طالبعلمی میں ایک مشورہ کے لئے ہوئی جس کی تفصیل آپ نے "مجالس حکیم الامت[1]" میں خود ہی قلم بند فرمائی ہے'

---

[1] اس کتاب میں والد ماجدؒ نے حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی مجلسوں کا حال اور چیدہ چیدہ ملفوظات نقل فرمائے ہیں جو آپ نے بروقت قلمبند فرمائے تھے۔ یہ کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔

فرماتے ہیں کہ:

"۱۳۲۲ھ میں جب احقر کی تعلیم میں یونانی فلسفہ کی کتاب میبذی کا نمبر آیا تو مجھے والد محترم سے سنی ہوئی بات یاد آئی کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کی رائے مدارس عربیہ میں یونانی فلسفہ کی تعلیم کے خلاف تھی اور غالباً کسی وقت اس کے درس کو دارالعلوم کے نصاب سے خارج کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا' اس وقت مجھے بھی تردد ہوا کہ یہ فن پڑھوں یا نہیں"؟

والد محترم حالانکہ حضرت گنگوہیؒ سے والہانہ عقیدت رکھنے والے تھے مگر اس وقت ایک دانشمندانہ فیصلہ یہ فرمایا کہ حضرت گنگوہیؒ تو اس وقت دنیا میں نہیں۔ ان کے بعد حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کو آپ کا قائم مقام سمجھتا ہوں' اس لئے مناسب یہ ہے کہ تمھارے بارے میں ان کے مشورہ پر عمل کیا جائے' اسی مقصد سے مجھے ساتھ لے کر تھانہ بھون کا سفر کیا۔

میں اس طالب علمی کے دور میں حضرت حکیم الامت سے مکمل اعتقاد کے باوجود وہاں کی حاضری سے اس لئے ڈرتا تھا کہ دور دور سے یہ سنا کرتا تھا کہ حضرت کے یہاں بڑے قواعد و ضوابط ہیں۔ خلاف ورزی پر ناراضی کا بھی خطرہ رہتا ہے' والد صاحب کے حکم کی بناء پر ساتھ جانے کی ہمت کرلی۔ آگے فرماتے ہیں:

"چونکہ والد صاحبؒ حضرت کے ہم سبق تھے۔ بے تکلف ملاقات دیکھنے کے قابل تھی۔ والد صاحبؒ نے پہلی ہی ملاقات میں فرمایا کہ اس وقت میرے آنے کا سبب یہ لڑکا ہے' میں آگے بڑھا' حضرتؒ نے نہایت شفقت سے مجھے سینہ سے لگا کر سر پر ہاتھ رکھا۔ والد صاحبؒ نے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ یہاں آتا ہوا اس لئے ڈرتا تھا کہ یہاں بہت قواعد و ضوابط ہیں ان کی پابندی کیسے ہوگی۔

حضرتؒ نے نہایت شفقت سے فرمایا کہ "بھائی مجھے تو خواہ مخواہ لوگوں نے بدنام کیا ہے میں از خود کوئی قاعدہ ضابطہ نہیں بناتا۔ لوگوں کی غلط روش نے مجھے مجبور کردیا کہ آنے والے کو کسی وقت اور قاعدہ کا پابند کراؤں ورنہ یہ تو مجھے کسی وقت ایک دفعہ اللہ کا نام بھی نہ لینے دیں۔ دوسرے کام اور آرام کا توذکر کیا۔ پھر فرمایا کہ "تم تو میری اولاد کی جگہ ہو' تمہیں کیا فکر ہے جب چاہو آیا کرو اور میرے یہاں جو قواعد و ضوابط ہیں ان سے مستثنیات اتنی ہیں

کہ مستثنیٰ منہ سے بڑھ جاتے ہیں تم بے فکر رہو۔"

حضرتؒ کی اس شفقت اور لطف و کرم نے پہلی ہی مرتبہ میرے دل میں ایسا گھر کرلیا کہ وہاں سے لوٹنے کا دل نہ چاہتا تھا' اس وقت تو نماز کا وقت تھا اور نماز ظہر کے بعد عام مجلس کا' اس میں اللہ تعالیٰ نے شرکت نصیب فرمائی' شام کو حضرت والا نے خصوصی ملاقات کا موقع عنایت فرمایا تو والد صاحبؒ نے میرے آنے کی غرض کا ذکر فرمایا

حضرتؒ نے فرمایا ہاں مجھے معلوم ہے کہ اس معاملہ میں حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کی رائے میں اختلاف تھا' حضرت نانوتویؒ یونانی فلسفہ پڑھنے پڑھانے کے اس لئے حامی تھے کہ اسلامی عقائد سے دفاع انہیں اصول و قواعد کی رو سے کیا جاسکے' جو یہ فلسفہ پیش کرتا ہے اور حضرت گنگوہیؒ کی نظر اس پر تھی کہ اس فلسفہ کے بہت سے نظریات اسلامی عقائد کے خلاف ہیں ان کو دینی مدارس میں درس کے طور پر پڑھنا دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کا سبب ہو سکتا ہے۔

فلسفہ پڑھنے کی تلقین

پھر فرمایا کہ "دونوں بزرگ ہمارے مقتدا اور پیشوا ہیں' ان میں سے جس کی رائے پر بھی کوئی عمل کرلے خیر ہی خیر ہے لیکن تمہارے متعلق میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ضرور اس فن کو پڑھو اور محنت سے پڑھو تاکہ اس کا بطلان تم پر خود واضح ہو جائے' مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ تمہیں وہ ضرر نہ ہو گا جس کا خطرہ حضرت گنگوہیؒ کے پیش نظر تھا۔"

پھر فرمایا کہ "ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اس وقت تمام مدارس اسلامیہ میں اس فن کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے اگر تم نے یہ فن نہ پڑھا فلسفہ جاننے والے علماء کے سامنے ایک مرعوبیت کا اثر تم پر رہے گا اور سمجھ کر پڑھ لیا تو یہ مرعوبیت بھی نہ رہے گی۔ اور انشاء اللہ اس کے غلط نظریات کا بطلان تمہیں پوری طرح معلوم ہو جائے گا۔

عمر کی یہ پہلی تعلیم تھی جو حضرتؒ سے حاصل کی اور واپس آکر میبذی کا سبق شروع کیا۔ پھر صدرا' شمس بازغہ وغیرہ فلسفہ کی تمام درسی کتابیں پڑھیں۔"

(مجالس حکیم الامت ص ۱۳ تا ۱۵)

جدید فلسفہ

دار العلوم دیوبند کے نصاب میں قدیم فلسفہ رائج تھا' جدید فلسفہ شامل نصاب نہ تھا۔ آپ کے استاذ محترم حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے درس حدیث کے دوران کئی بار طلبہ سے فرمایا کہ پہلے زمانہ میں ہمارے اسلاف نے قدیم فلسفہ پڑھ کر اس کا رد کیا تھا۔ اس وقت وہی رائج تھا لیکن آج کل قدیم کی جگہ جدید فلسفہ نے لے لی ہے۔ اب دنیا میں یہی فلسفہ رائج ہے اس لئے جدید فلسفہ ضرور پڑھنا چاہیے تاکہ نئے فتنوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ چنانچہ حضرت والد ماجدؒ اور دوسرے ممتاز طلبہ کی درخواست پر حضرت شاہ صاحبؒ نے جدید فلسفہ کی مشہور کتاب "الفلسفۃ العربیہ" بھی خاص طور پر ان حضرات کو پڑھائی۔

حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ "مجھے فلسفہ کے کسی مسئلہ میں کبھی کوئی اشکال پیش نہیں آیا اور حضرت تھانویؒ کی پیشگوئی کے مطابق اس کے غلط نظریات کا بطلان روز روشن کی طرح واضح ہوتا چلا گیا۔

شعر و ادب

شعر و سخن[1] کا آبائی ذوق وراثت میں ملا تھا' فارسی ادب کی پنج سالہ تعلیم و تربیت نے جو اپنے والد بزرگوار سے حاصل فرمائی تھی' اس فطری ذوق کو پروان چڑھایا پھر خوش قسمتی سے عربی ادب کے تمام اسباق آپ کو شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے پڑھنے کا موقع ملا۔ جو باذوق اور ذی استعداد طلبہ کے نہایت قدر شناس تھے اور ان سے پدرانہ شفقت فرماتے تھے' ان کی خصوصی توجہ اور تعلیم و تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا' عربی نظم و نثر کی مشق نہایت اہتمام سے کرائی' اس زمانہ میں طلبہ اردو زبان کے مشاعرے جمعہ کی فرصت میں منعقد کیا کرتے تھے' استاذ محترم حضرت شیخ الادبؒ نے ملامت کی کہ اگر شعر کہنا ہو تو عربی

---

[1] اس سلسلہ کی بیشتر تفصیلات حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے عربی رسالہ نفحات (ص ۲۷) سے اور آپ کی مشہور تصنیف "کشکول" (ص ۲۲۷ تا ۲۲۸) سے ماخوذ ہیں' کچھ تفصیلات ایسی بھی درج کی جا رہی ہیں جو ان کتابوں میں نہیں وہ احقر نے حضرتؒ سے براہ راست بار بار سنی ہیں۔

میں کہو جو تمہارے مقصد تعلیم میں معین ہو' چنانچہ استاذ محترم نے ایک ادبی مجلس "نادیۃ الادب" کے نام سے قائم فرمائی' جس کے تحت ہفتہ وار مشاعرہ عربی زبان میں ہونے لگا' مشاعرے کی صدارت استاد الاساتذہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے' بسا اوقات مصرع طرح دیا جاتا جس پر طلبہ کے علاوہ خود حضرات اساتذہ بھی اپنا اپنا کلام مشاعرے میں سناتے' داد و تنقید کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رہتا' ان مشاعروں میں آپ نے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا' متعدد جاندار قصیدے' اثر انگیز مرثیے اور مختلف اشعار عربی میں کہے اور اساتذہ کرام سے خوب خوب داد لی۔

آپ نے شعر گوئی کی ابتداء عربی میں کی پھر فارسی زبان میں بھی کہنے لگے جس پر آپ کو پہلے سے مادری زبان کی طرح عبور حاصل تھا اور اس کے بعد اردو میں اشعار کا سلسلہ شروع ہو گیا' ان تینوں زبانوں میں آپ بلند پایہ اشعار بے تکلف کہتے تھے۔ شعر و شاعری کو آپ نے کبھی بھی مشغلہ کے طور پر نہیں اپنایا آپ کی دلچسپیوں کا محور علمی و دینی مشاغل تھے جن سے آخر حیات تک فرصت نہ ملی مگر خداداد طبعی ذوق نے تینوں زبانوں میں جو کلام موزوں کرایا ہے وہ بھی قابل دید' برجستہ' نہایت اثر انگیز اور مفید اصلاحی مضامین پر مشتمل ہے۔ اردو و فارسی کلام تو آپ کی دلچسپ تالیف "کشکول" کے آخر میں عرصہ دراز سے بار بار شائع ہوتا رہا۔ ۱۳۹۳ھ میں عربی کلام کا مجموعہ بھی کراچی سے بنام "نفحات" شائع ہو چکا ہے۔

بزرگوں سے عقیدت و محبت

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بزرگوں اور اولیاء اللہ کی گہری عقیدت و محبت اپنے والد ماجد سے وراثت میں پائی تھی جو بزرگوں کے شیدائی اور ان کا زندہ تذکرہ تھے۔ مفتی صاحبؒ نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی کہ گھر میں بزرگوں ہی کے تذکرے تھے جب کوئی پریشانی کی بات ہوتی تو گنگوہ کو دعا کے لئے خط لکھا جاتا' حضرت گنگوہیؒ کے دعائیہ کلمات جواب میں آتے تو گھر میں سنائے جاتے۔ مگر ابھی آپ کی عمر نو ہی سال تھی کہ ۱۳۲۳ھ میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ کی وفات ہو گئی اور آپ کو ان کی خدمت میں حاضری کا موقع نہ مل سکا[1]۔

---

[1] مجالس حکیم الامت ص ۱۰

حضرت شیخ الہندؒ سے استفادہ اور اصلاحی تعلق

حضرت گنگوہیؒ کے بعد لوگوں کی عقیدت و محبت کا مرکز تین بزرگ تھے (۱) شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہ (۲) شیخ العلماء حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہ (۳) حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی رحمتہ اللہ علیہ' حضرت مفتی صاحبؒ کو تینوں بزرگوں سے یکساں عقیدت[1] تھی۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہ کا وطن دیوبند تھا جنھیں قصبہ کے لوگ "بڑے مولوی صاحب" کہا کرتے تھے۔ "شیخ الہند" کا لقب اس وقت مشہور نہ ہوا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے اور سب مدرسین اور منتظمین ان کے شاگرد یا معتقد۔

حضرت مفتی صاحب رحمتہ اللہ علیہ بچپن ہی سے اپنے والد ماجد کے ساتھ ان کی خدمت میں بڑے شوق و ذوق سے حاضر ہوا کرتے تھے اور جب آپ دارالعلوم کے درجہ فارسی و ریاضی میں زیر تعلیم تھے اسی وقت سے آپ کا معمول تھا کہ ہر سال جب حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ بخاری شریف کے درس کا افتتاح فرماتے اور سب علماء و طلبہ اس میں تبرکاً شریک ہوتے' آپ بھی ضرور حاضر ہوتے' اسی طرح تعلیمی سال کے آخر میں جب بخاری شریف کا درس ختم ہوتا اس میں بھی شریک ہوتے اس طرح آپ کو ان سے کئی بار "اطراف بخاری" پڑھنے کا موقع ملا۔

حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کے مکان پر ایک مجلس بعد عصر ہوا کرتی تھی۔ آپ اس میں بھی اپنے والد ماجد کے ساتھ شریک ہوتے' جوں جوں حاضری بڑھتی گئی شوق روز افزوں ہوتا گیا۔ اور اس مجلس کا ایسا چسکا لگا کہ اب والد صاحب کے بغیر بھی بکثرت حاضری ہونے لگی' بعد عصر کی قید بھی نہ رہی' جب اسباق سے ذرا فرصت ملتی حضرت کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ آپ اپنی تصنیف "مجالس حکیم الامت" میں اس کے تاثرات بیان فرماتے ہیں کہ:

"اکابر علماء و صلحاء کا عجیب و غریب مجمع ہوتا تھا' ان (شیخ الہندؒ) کی باتیں تو کچھ پلے نہیں پڑتی تھیں مگر اس مجلس میں بیٹھنے کا ایک شوق بلا کسی سبب کے دل میں پیدا ہو گیا' اور

---

[1] مکاتیب حکیم الامتؒ میں ۲ (زیر طبع)

اب والد صاحب کی معیت اور بعد عصر کی قید بھی ختم ہو گئی جب منہ اٹھا وقت بے وقت حاضر ہو گیا۔ اکابر کی شفقت جو بچوں پر ہوا کرتی ہے مجھے بھی نصیب ہونے لگی۔ رمضان المبارک میں حضرت کا یہ معمول تھا کہ (اپنے مکان پر) تمام رات نوافل یا تراویح میں قرآن شریف سنتے تھے' دو سال حق تعالیٰ نے اس میں بھی حاضری کی توفیق عطا فرمائی۔"

آپ کی عربی تعلیم کا دور ۱۳۳۰ھ میں شروع ہوا' اس وقت دارالعلوم دیوبند کے ناظم تعلیمات بھی حضرت شیخ ہی تھے' اس لئے تعلیمی معاملات میں بھی حضرت سے مراجعت کی نوبت آنے لگی۔[۲]

آپ کی درخواست بیعت اور شیخ الہندؒ کی خاص شفقت

حضرت شیخ الہندؒ کو بھی آپ پر بے حد شفقت تھی' اگر کسی روز حاضر نہ ہوتے تو دریافت فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کو بخار ہوا' دو روز تک حاضر نہ ہو سکے' تیسرے روز جب پہنچے تو دیکھا کہ حضرت کہیں جانے کے لئے کھڑے ہیں' معلوم ہوا کہ آپ ہی کے گھر جانے کا قصد فرمایا تھا۔

اس عرصے میں آپ نے کئی مرتبہ عرض کیا کہ "حضرت مجھے بیعت فرما لیجئے" ہمیشہ یہی فرمایا کہ "طالب علمی سے فارغ ہو جاؤ جب کریں گے"[۲] حضرت کا اصول تھا کہ کسی طالبعلم کو بیعت نہ فرماتے تھے تاکہ طالب علمی کے لئے جس یکسوئی کی ضرورت ہے اس میں خلل نہ آئے۔

ملک کے سیاسی حالات کے باعث شیخ الہندؒ کی مصروفیات

۱۳۳۲ھ میں جب آپ کی تعلیم متوسط کتابوں تک پہنچی' ہدایہ وغیرہ کے اسباق تھے اسوقت پورے ہندوستان میں ترکی خلافت پر اہل یورپ کی یورش کے قصے ہروقت زبانوں پر تھے' حضرت شیخ الہندؒ کی مجلس کا رنگ بھی بدلا ہوا تھا' اب ان کی توجہ دارالعلوم کی تعلیمی

---

[۱] مجالس حکیم الامتؒ ص ۱۱ [۲] مکاتیب حکیم الامتؒ (مخطوطہ زیر طبع) ص ۳۰۲

خدمات سے زیادہ ہندوستان کو انگریزی تسلط سے آزاد کرا کے اسلامی حکومت قائم کرنے کے جہاد پر لگ گئی' اور یہ راز بعد میں کھلا کہ اس سلسلہ میں "ریشمی رومال" کی مشہور تحریک کے قائد حضرت شیخ الہندؒ ہی تھے۔ خفیہ طور پر اسلامی ممالک کے سربراہوں خصوصاً ترکی حکومت سے رابطہ قائم تھا اور ہندوستان کے مختلف پوشیدہ مقامات پر اسلامی فوج انگریزی حکومت کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کے لئے تربیت حاصل کر رہی تھی' یہ سب کچھ حضرت شیخ الہند کی قیادت و رہنمائی میں انتہائی رازداری کے ساتھ ہو رہا تھا۔

شیخ الہندؒ سے پڑھنے کی تمنّا

حضرت والد صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ نے کوشش کر کے ۱۳۳۳ھ میں مشکوٰۃ و جلالین وغیرہ کے وہ اسباق پورے کر لئے جن کے بعد دورہ حدیث کا نمبر آتا ہے۔ تمنا یہ تھی کہ اگلے سال حضرت شیخ الہندؒ سے صحیح بخاری پڑھنے کا موقع مل جائے مگر اسی سال رمضان سے یہ خبر سنی جانے لگی کہ حضرتؒ کا ارادہ سفر حج کا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ ہجرت کر کے جا رہے ہیں' کسی کا خیال تھا کہ ترکی حکومت کی امداد کے لئے سفر ہے' حضرت والد ماجد فرماتے ہیں کہ "ہم بڑی حسرت کے ساتھ یہ مناظر دیکھتے رہے بالآخر حضرت حج کے لئے روانہ ہو گئے اور پہلی عالمگیر جنگ عظیم چھڑ گئی۔

شیخ الہندؒ کی گرفتاری

۱۳۳۴ھ پورا حضرت شیخ الہندؒ کا حجاز میں صرف ہوا۔ حضرت والد صاحبؒ نے اس سال اپنا دورہ حدیث اس امید پر ملتوی کیا کہ حضرت شیخ واپس آجائیں گے تو دورہ حدیث ان کے سامنے ہوگا' اس سال فنون کی باقی کتابیں لے لیں مگر بحکم قضا و قدر ۱۳۳۵ھ میں حضرت شیخ الہندؒ انگریزوں کے اسیر ہو کر مالٹا جیل بھیج دیئے گئے اور حضرت والد صاحبؒ کی تمنا دل ہی دل میں رہ گئی اور پھر جو کچھ ہوا اس کی المناک تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

---

[1] مجالس حکیم الامتؒ ص ۱۲

حضرت انور شاہ کشمیریؒ سے استفادہ اور دورۂ حدیث

بالآخر ۱۳۳۵ھ میں آپ نے دورہ حدیث حجۃ الاسلام حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے سامنے کیا' فلسفہ کی بعض کتابیں بھی آپ نے حضرت شاہ صاحب سے پڑھیں' حضرت شاہ صاحبؒ کے علمی کمالات' باطنی تقدس' دقت نظر' وسعت مطالعہ اور خصوصیت سے قوت حافظہ علمی حلقوں میں ضرب المثل ہیں۔ علم حدیث میں تو ان کے تبحر اور حفظ و اتقان نے مشہور ائمہ حدیث ابن تیمیہؒ' ابن قیمؒ اور حافظ ابن حجر کی یادیں تازہ کر دی تھیں' اس تبحر علمی کے ساتھ طبیعت میں انتہاء درجہ کی سادگی تھی' حضرت والد صاحبؒ آپ کی حیرتناک قوت حافظہ' علمی کارناموں اور دلکش سادگی کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات اکثر سنایا کرتے تھے۔ حضرت والد صاحبؒ کی تصانیف میں علمی تحقیق اور وسعت مطالعہ کا جو رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے اس میں بڑا دخل حضرت شاہ صاحبؒ کی تعلیم و تربیت کا ہے۔

طالب علمی کے بعد تدریس و تصنیف کے کاموں میں بھی حضرت شاہ صاحبؒ سے استفادہ کا سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ روز افزوں ہو تا گیا۔ مناظروں میں بھی ساتھ رہے' کئی مناظروں میں حضرت شاہ صاحبؒ خود تشریف نہ لے جاسکے تو آپ کو بھیجا۔

ردّ قادیانیت کا جو کام حضرت شاہ صاحبؒ نے نہایت اہتمام سے شروع فرمایا تھا۔ اس میں آپ نے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس موضوع پر کئی کتابیں' ختم نبوت' ہدیۃ المہدیین (بزبانِ عربی) دعاوی مرزا' مسیح موعود کی پہچان' اور التصریح بما تواتر فی نزول المسیح' (بزبانِ عربی) حضرت شاہ صاحب ہی کی رہنمائی میں تالیف فرمائیں' قادیانیوں کے خلاف مشہور "مقدمہ بہاولپور" جو بہاولپور کی عدالت میں دائر تھا اور جس میں مسلمانوں کو فتح مبین حاصل ہوئی' اس میں حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف سے جو تحریری بیان عدالت میں پیش ہوا' وہ بھی حضرت والد صاحبؒ نے وہیں پوری رات جاگ کر تحریر کیا تھا۔ غرض آپ نے حضرت شاہ صاحبؒ سے خوب خوب استفادہ کیا اور قدم قدم پر استاذ موصوف کی دعاؤں سے مالا مال ہوتے رہے۔

دورۂ حدیث میں آپ کے اساتذہ

آپ کو دورہ حدیث کی کتابیں اور پورا فن حدیث جن عظیم القدر اساتذہ سے پڑھنے کا

شرف حاصل ہوا وہ سب ہی قدیم محدثین و فقہاء اور اکابر اولیاءاللہ کی زندہ یادگار تھے' ان سب کے علمی و عملی کمالات اور باطنی تقدس کا بیان مجھ جیسا بے بضاعت کرنا بھی چاہے تو کیسے کرے۔ یہاں ہر کتاب کے ساتھ ان مقدس بزرگوں کے صرف اسماء گرامی ذکر کیے جاتے ہیں جن سے آپ نے یہ کتابیں درساً پڑھی ہیں۔

(۱) صحیح بخاری' جامع ترمذی اور شمائل ترمذی' حافظ عصر شیخ المشائخ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمتہ اللہ علیہ سے۔

(۲) صحیح مسلم' شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمتہ اللہ علیہ سے۔

(۳) سنن ابوداؤد۔ عارف باللہ محدث و فقیہ' حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے۔

(۴) سنن ابن ماجہ' استاذ الاساتذہ حضرت مولانا غلام رسول ہزاروی صاحب رحمتہ اللہ علیہ

(۵) مؤطا امام مالک' مؤطا امام محمد' اور شرح معانی الاثار للطحاوی و حصن حصین۔ مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے۔

والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ کو صحاح ستہ اور مؤطین کی روایت و تدریس کی اجازت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمتہ اللہ علیہ سے بھی حاصل ہے جو حضرت نے ۱۳۴۸ھ میں تحریر فرمائی[1] آپ نے علم حدیث میں استفادہ اگرچہ سب سے زیادہ حضرت شاہ صاحب کشمیری رحمتہ اللہ علیہ سے کیا' ان کے درس کی تقریر بھی زبان عربی میں قلمبند فرمائی اور حدیث کی کئی کتابیں ان کے زیر ہدایت تالیف فرمائیں مگر آپ نے حصن حصین جو مفتی اعظم ہند حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب سے پڑھی اس کی سند سب سے عالی ہے۔ کیونکہ اس میں حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ کے درمیان صرف ایک واسطہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ کا ہے بر خلاف دوسری کتب حدیث کے کہ ان میں ایک سے زیادہ واسطے ہیں[2]۔

---

[1] سند اجازت کا پورا متن "مکاتیب حکیم الامت" (مخطوطہ زیر طبع ص ۱۷۲) میں محفوظ ہے۔

[2] تفصیلات کے لئے حضرت والد صاحبؒ کا عربی رسالہ "الاوزیاد السنی علی الیانع الجنی" دیکھا جائے جس کا نیا ایڈیشن کراچی سے ۱۳۸۳ھ میں طبع ہوا ہے اس میں آپ نے اپنے تمام اساتذہ کرام کی اسانید شرح و بسط سے بیان فرمائی ہیں۔

تحصیل علوم سے فراغت اور مشغلہ تدریس

۱۳۳۵ھ میں آپ نے دورہ حدیث کیا۔ کچھ فنون کی کتابیں باقی تھیں جن کی تکمیل ۱۳۳۶ھ میں فرمائی، درس نظامی کی مکمل تعلیم سے نہایت ممتاز حیثیت میں فارغ ہوئے۔ اس وقت عمر بائیس سال تھی، اساتذہ کرام اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم کی نگاہ انتخاب عرصہ سے آپ پر تھی، اسی سال آپ کو کچھ اسباق پڑھانے کے لئے سپرد فرما دیئے گئے اور غالباً اسی سال دیوبند کے ایک انصاری خاندان میں جناب کرم کریم صاحب کی نیک بخت صاجزادی (احقر کی والدہ ماجدہ) سے آپ کی شادی ہوئی۔

بلامعاوضہ خدمت دین کا ارادہ

زمانہ طالب علمی سے آپ کا ارادہ تھا کہ خدمت دین بغیر کسی معاوضہ کے محض لوجہ اللہ کریں اور معاش کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ اختیار فرمائیں اس ارادہ کے پیش نظر زمانہ طالب علمی میں کئی دوسرے فنون بھی آپ نے حاصل کر لئے تھے۔

خطّاطی اور جلد سازی

چنانچہ خطّاطی اور کاپی نویسی میں خوب مہارت تھی۔ بعض کتابیں آپ ہی کی کتابت سے طبع بھی ہوئیں، خط نسخ اور نستعلیق میں ماہرین فن آپ کے زور قلم کی تحسین کرتے تھے۔ اسی مخلصانہ جذبہ کے تحت جلد سازی میں بھی مہارت حاصل کی، اس زمانہ میں اپنی کتابوں کی جلد بندی عام طور پر خود ہی فرماتے تھے، راقم الحروف نے اپنے بچپن میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک مطبوعہ کتاب ایسی دیکھی تھی جس کے مصنف بھی آپ تھے، کتابت بھی خود کی تھی اور غالباً جلد سازی بھی خود فرمائی تھی، افسوس کہ اس کتاب کا نام یاد نہیں رہا۔

طب یونانی

علمی خدمات کے معاوضہ سے مستغنی رہنے کے لئے دارالعلوم میں آپ نے طب یونانی کے نصاب کی بھی تکمیل فرمائی۔ اس فن میں آپ کے رفیق درس جناب حکیم محفوظ الحق

صاحب رحؒ مشہور حاذق طبیب ہوئے جن کو ضلع سہارنپور اور اطراف میں نہایت کامیاب طبیب سمجھا جاتا تھا[1] ان دونوں حضرات نے نفیسی استاذ العلماء حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ سے اور شرح اسباب مولانا حکیم محمد حسن صاحب برادر شیخ الہندؒ سے پڑھی لیکن حضرت والد ماجدؒ فرمایا کرتے تھے کہ میرا یہ شوق باوجود کوشش کے پورا نہ ہو سکا کہ علم دین کی خدمت بغیر کسی معاوضہ کے انجام دوں، اس لئے کہ جب تدریس، افتاء اور تصنیف و تبلیغ کا کام شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ان علمی مشاغل کے ساتھ کوئی دوسرا مستقل کام نہیں کیا جا سکتا۔ علمی مصروفیات اتنی ہمہ گیر تھیں کہ کسی اور کام کے لئے وقت نکالنا ممکن نہ رہا۔ یہی بات امام مالکؒ نے اپنے وسیع تجربہ کی بنا پر فرمائی تھی کہ "العلم لا یعطیک بعضہ حتی تعطیہ کلک" یعنی علم تمہیں اپنا ذرا سا حصہ بھی اس وقت تک نہیں دے گا جب تک تم اپنا سب کچھ اس کو نہ دیدو۔

قناعت اور علمی مشاغل

آخر مجبور ہو کر ان تمام فنون کو جو ذریعہ معاش کے لئے حاصل کیے تھے ترک کرنا پڑا اور یکسوئی کے ساتھ تدریس و افتاء تصنیف و تالیف اور تبلیغی خدمات میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ دارالعلوم میں مالی وسائل کی قلت تھی۔ اساتذہ کرام کی تنخواہیں نہایت قلیل ہوتی تھیں، قارئین کو حیرت ہوگی کہ ابتداءً دارالعلوم میں آپ کو صرف "پانچ روپے ماہوار" وظیفہ ملتا تھا، اسی پر قناعت فرمائی پھر رفتہ رفتہ مشاہرہ میں تھوڑا تھوڑا اضافہ ہوا۔ جب آپ ۲۶ سال کی جلیل القدر خدمات کے بعد دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوئے تو اس وقت بھی مشاہرہ صرف ۶۵ روپے تھا۔ اس عرصہ میں دوسرے مدارس سے بڑی بڑی تنخواہوں پر بلانے کی مسلسل کوشش ہوتی رہی، مدرسہ عالیہ کلکتہ سے سات سو روپے مشاہرہ کی پیشکش بار بار کی گئی جہاں کام بھی دیوبند سے بہت کم تھا مگر پیش نظر تنخواہ کبھی نہ تھی۔ دیوبند کے قلیل پر قناعت کی، مادر علمی کو چھوڑنا پسند نہ فرمایا۔

سلوک و تصوّف اور اصلاح باطن کی فکر

تمام بزرگان سلف کی طرح یہ حقیقت آپ کے سامنے بھی تھی کہ کسی بزرگ کی

---

[1] وفات اواخر ۱۳۶۳ھ

خدمت و صحبت میں رہ کر تزکیہ باطن اور ذکر اللہ کے بغیر کتابی علوم بے روح رہتے ہیں' یہی وہ احساس تھا جس نے آپ کو شیخ الہند" کا شیدائی بنا دیا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی خصوصی تربیت اور شفقتوں نے سلوک و طریقت کی جس شاہراہ پر گامزن کر دیا تھا اس کے اگلے مراحل طے کرنے کے لئے آپ درسیات سے فراغت کا انتظار فرما رہے تھے کیونکہ حضرت" نے وعدہ فرمایا تھا کہ بیعت طالب علمی سے فراغت کے بعد کریں گے۔

مگر ۱۳۳۶ھ میں درس نظامی کی تعلیم سے فراغت ہوئی تو حضرت شیخ الہند" مالٹا جیل میں تھے' ان کی مفارقت آپ پر پہلے ہی بہت شاق تھی' اور اب تو یہ انتہائی صبر آزما بن گئی' حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری" بھی اس وقت ہندوستان میں تشریف نہ رکھتے تھے۔

دو بزرگوں پر نظر جاتی تھی' ایک حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری رحمتہ اللہ علیہ دوسرے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمتہ اللہ علیہ۔ آپ کے والد ماجد" کی رائے میں ترجیح اس کو ہوئی کہ حضرت تھانوی" کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ سابقہ حاضری اور تعلیم سے ایک مناسبت قائم ہو چکی ہے۔

تھانہ بھون میں تیسری حاضری

غالباً[1] ۱۳۳۷ھ تھا جس میں آپ اپنے والد ماجد کے ساتھ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی" کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوئے۔ اس تیسری حاضری کا مقصد سلوک و طریقت کی تعلیم حاصل فرمانا تھا۔ آپ کو معلوم تھا کہ حضرت تھانوی قدس سرہ صاف اور سچی بات کو بہت پسند فرماتے ہیں۔ آپ نے صاف صاف عرض کر دیا کہ "مجھے حق تعالیٰ نے کچھ عرصہ حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضری کی توفیق بخشی ہے' دل کی خواہش یہ تھی کہ ان سے بیعت ہوں مگر حضرت اس وقت اسیر ہیں اور معلوم نہیں کب رہائی ہو' اب میں حضرت ہی سے مشورہ کا طالب ہوں مجھے کیا کرنا چاہیے۔

---

[1] مجالس حکیم الامت" ص ۱۹ مگر مکاتیب حکیم الامت" (قلمی ص ۳) میں ۱۳۳۶ھ تحریر ہے۔

حضرت حکیم الامتؒ کی پہلی تعلیم

حضرت نے بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ "اس میں کیا اشکال ہے۔ تصوف و سلوک اعمال باطنہ کی اصلاح کا نام ہے جو ایسی ہی فرض ہے جیسے اعمال ظاہرہ کی اصلاح' اس کو مؤخر کرنا تو میرے نزدیک درست نہیں لیکن اس کے لئے بیعت ہونا کوئی شرط نہیں' بیعت کے لئے حضرت مولانا (شیخ الہندؒ) کا انتظار کریں اور حضرت کے واپس تشریف لانے تک میں خدمت کے لئے حاضر ہوں' میرے مشورے کے مطابق اصلاح کا کام شروع کر دیں' پھر فرمایا: آپ کے ذمہ دو کام ہوں گے' ایک اپنے حالات کی اطلاع' دوسرے اس پر جو میں مشورہ دوں اس کا اتباع' پھر حضرت نے کچھ تسبیحات اور معمولات کی تلقین فرمائی اور ضروری نصیحتوں کے بعد رخصت فرمادیا۔

دیوبند واپس آکر کچھ روز اس سلسلہ میں حضرت حکیم الامتؒ سے خط و کتابت رہی مگر بہت وقفوں کے ساتھ' کیونکہ حضرت والد صاحبؒ دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات شروع فرما چکے تھے۔ جس میں اوقات زیادہ مشغول ہو گئے' ادھر آپ کو ملک کے سیاسی حالات نے بھی بہت کم مہلت دی۔

اُس وقت کے سیاسی حالات

یہ وہ زمانہ تھا جب ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم نے پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا' اہل یورپ کی متحدہ یورش اور سازشوں سے ترکی خلافت پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ اسی سلسلہ میں جہاد کی کوششوں کی بنا پر مالٹا جیل میں نظربندی کی صعوبتوں سے گذر رہے تھے۔ خلافت کو پارہ پارہ کرنے میں انگریزوں کا ہاتھ تھا' اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی حکومت کے خلاف جذبات بھڑک اٹھے۔ "خلافت کمیٹی" قائم ہوئی اور چند ہی روز میں پورے متحدہ ہندوستان میں پھیل گئی' ہندوستان کو انگریزی تسلط سے آزاد کرانے کی کوششیں تیز ہو گئیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کو جیل سے رہا کرانے کی تحریک نے زور پکڑ لیا۔ ہندوستان کے تمام مسلمان اور خصوصاً علماء و صلحاء اور مدارس دینیہ بھی اس تحریک

سے متاثر ہوئے، تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھنا بھی آسان نہ رہا، پورے ملک میں ہنگامے تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت سلوک اور تحریک خلافت میں عملی حصہ

بالآخر ۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ (مارچ ۱۹۲۰ء) میں حضرت شیخ الہند قدس سرہ مالٹا سے رہا ہو کر پانچ سال بعد دیوبند تشریف لائے تو تحریک خلافت اور آزادی ہند کی قوت کہیں سے کہیں پہنچ گئی، حضرت کی زیارت و ملاقات کے لئے اطراف ملک سے انسانوں کا سیلاب امڈ آیا، حضرت شیخ الہندؒ اپنے ضعف وعلالت کے باوجود انہی ہنگاموں میں مشغول و مصروف رہے۔ حضرت والد صاحبؒ بیعت ہونے کے لئے موقع کی تلاش میں تھے، اسی حالت میں ایک روز آپ نے اور آپ کے رفیق درس حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور چند حضرات نے موقع پاکر حضرت شیخ الہندؒ کے ہاتھ پر بیعت طریقت کی، چند تسبیحات کی تلقین حضرت نے فرمائی اس سے زائد اس طریقہ میں استفادہ کا موقع نہ تھا۔ آزادئ ہند کی تحریک زوروں پر تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ایماء پر والد ماجدؒ بھی ان تحریکات میں مشغول رہے[۱]۔

حضرت شیخ الہندؒ کی وفات

مالٹا سے رہائی کے بعد حضرت شیخ الہندؒ ایک سال چھ ماہ حیات رہے اور ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو دہلی[۲] میں وفات ہوگئی۔

حضرت والد صاحبؒ نے اگرچہ سالہا سال حضرت شیخ الہندؒ سے اس اہتمام سے استفادہ کیا تھا کہ اسباق سے فارغ اوقات بیشتر حضرت ہی کی خدمت وصحبت میں گزرتے

۱؎ مجالس حکیم الامتؒ ص ۱۹ ۲؎ مجالس حکیم الامتؒ ص ۱۹

تھے۔ بچپن سے یہ سلسلہ شروع ہو کر حضرت ؒ کی وفات تک جاری رہا' صرف اسیری کا زمانہ اس سے مستثنیٰ تھا' اسلامی حکومت کے قیام کے لئے حضرت ؒ کی سیاسی تحریکات میں بھی عملی حصہ لیتے رہے مگر حضرت شیخ الہند ؒ کی پر فیض تربیت کا یہ اثر بھی تھا کہ جوں جوں استفادہ بڑھا' تشنگی بڑھتی چلی گئی' حضرت ؒ کے حادثہ وفات پر آپ یوں محسوس فرماتے تھے کہ میں نے حضرت سے کچھ بھی حاصل نہ کیا' اس وقت کے کچھ تاثرات آپ نے "مکاتیب حکیم الامت ؒ" کے مقدمہ میں ظاہر کئے ہیں۔ فرماتے ہیں :

"حضرت (شیخ الہند ؒ) کی وفات کا جو غم ساری دنیا کو تھا مجھ جیسے غلام کو زیادہ ہونا ناگزیر تھا' لیکن اس کے ساتھ ہی دوسرا غم یہ تھا کہ میں استفادہ سے محروم رہا' وفات کے بعد ایک مدت تک تو طبیعت پر ایسی افسردگی رہی کہ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا نہ کسی کام کی ہمت۔"

غرض! حضرت شیخ الہند ؒ کی رہنمائی میں سلوک و تصوف کا جو سفر نئے ولولوں کے ساتھ شروع ہوا تھا' راستہ ہی میں رک گیا۔ کئی سال اسی عالم میں گزر گئے' اس عرصہ میں آپ کی دلچسپیاں تدریس و تصنیف تک محدود رہیں جن میں شب و روز کا انہماک تھا' ادھر حضرت شیخ الہند ؒ کی وفات سے تقریباً دو سال قبل ہی آپ کی شادی ہوئی تھی' اب عیال بڑھ رہا تھا تدریس و تصنیف سے جو وقت بچ جاتا وہ گھریلو ذمہ داریوں میں صرف ہونے لگا۔ اس عرصہ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی خدمت میں بھی نہ کوئی حاضری ہو سکی نہ خط و کتابت کا سلسلہ جو حضرت شیخ الہند ؒ کی رہائی کے وقت سے منقطع تھا دوبارہ شروع ہو سکا۔

چوتھی حاضری تھانہ بھون اور زندگی کا نیا دور

بالآخر ۱۳۴۳ھ یا ۱۳۴۴ھ میں[1] پھر وہی تشنگی آپ کو تھانہ بھون لے گئی جو ۱۳۳۶ھ میں

---

[1] مجالس حکیم الامت ؒ (۲۱) میں ۱۳۴۵ھ لکھا ہے اور "مکاتیب حکیم الامت ؒ" کے مقدمہ میں تردد کے ساتھ "۱۳۴۲ھ یا ۱۳۴۳" تحریر فرمایا ہے اور جو خط و کتابت "مکاتیب حکیم الامت ؒ" میں محفوظ ہے وہ رمضان ۱۳۴۴ھ سے شروع ہو کر ۱۰ رجب ۱۳۶۲ھ تک مسلسل جاری رہی ہے' اس مجموعہ سے قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ تھانہ بھون میں یہ حاضری ۱۳۴۳ھ یا ۱۳۴۴ھ میں ہوئی ہے (رفیع)

لے گئی تھی، اس وقت حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ حکیم الامتؒ سے خط و کتابت کا سلسلہ بند رہنے کے باعث حضرت والد صاحبؒ کو ایک قسم کی شرمندگی اس حاضری کے وقت دامن گیر تھی، مگر حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اسی شفقت کا معاملہ فرمایا جس کا مشاہدہ پہلے ہو چکا تھا، اس عرصہ کی طویل بے تعلقی کا کوئی اثر آپ کی طبیعت پر نہ پایا۔

اس مرتبہ والد صاحبؒ نے کھل کر اپنا حال عرض کیا کہ حضرت میری تمنا تو بہت ہے کہ تصوف و سلوک کے مراحل طے کروں، مگر سنتا ہوں کہ بڑے مجاہدوں اور ریاضتوں اور محنت و فرصت کا کام ہے، میں پیدائشی طور پر ضعیف بھی ہوں، زیادہ محنت برداشت کرنے کے قابل نہیں اور فرصت بھی کم ہے، وقت تمام درس و تدریس اور مطالعہ کے کاموں میں گذرتا ہے، کیا ان حالات میں بھی مجھے کوئی حصہ نصیب ہو سکتا ہے؟

حکیم الامتؒ کی حکیمانہ تعلیم

حضرت حکیم الامتؒ نے بڑی شفقت سے فرمایا کہ "آپ نے کیا کہا، کیا اللہ کا راستہ صرف اقویاء (قوی لوگوں) کے لئے ہے۔ ضعفاء (ضعیفوں) کے لئے نہیں؟ فارغ البال لوگوں کے لئے ہے کم فرصت لوگوں کے لئے نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ راستہ سب کے لئے کھلا ہوا ہے ہاں ہر ایک کے لئے عمل کا طریقہ مختلف ہے، ہم آپ کو ایسا طریق بتائیں گے جس میں نہ قوت کی ضرورت نہ فرصت کی۔ پھر فرمایا فرائض و واجبات اور سنن وغیرہ جو سب مسلمان ادا کرتے ہیں وہ تو اپنی جگہ ہیں، آپ تین چیزوں کی اور پابندی کر لیں۔ انشاء اللہ سارا سلوک اسی سے طے ہو جائے گا۔

(۱) تقویٰ اختیار کریں۔ اس کا مفہوم آپ کو بتلانے کی ضرورت نہیں، البتہ تقویٰ صرف نماز، روزہ اور ظاہری معاملات کا نہیں باطنی میں بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا ظاہری میں۔

(۲) دوسرے لایعنی (بے فائدہ) کام، کلام، مجلس، ملاقات سے پرہیز کریں۔ لایعنی سے میری مراد وہ کام ہے جس میں دین کا کوئی فائدہ ہو نہ دنیا کا۔

(۳) تیسرے بقدر ہمت و فرصت کچھ تلاوت قرآن روزانہ کیا کریں۔

آخر میں فرمایا کہ نسخہ تو آپ کے لئے اتنا ہی ہے اگر دل چاہے اور فرصت ہو تو صبح وشام "سُبْحَانَ اللّٰهِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" سو سو مرتبہ اور استغفار و درود شریف سو سو مرتبہ پڑھ لیا کریں اور نمازوں کے بعد "تسبیح فاطمہ" کا التزام کرلیں۔

حضرت والد صاحب" فرماتے ہیں کہ "میں نے ایک دو روز تھانہ بھون میں قیام کیا' حضرت بڑی شفقت ومحبت سے ہر وقت معاملہ فرماتے تھے' اس طرز تعلیم اور معاملہ شفقت نے میرے قلب کے گوشہ گوشہ کو حضرت کی محبت سے بھردیا۔" اس کے بعد مسلسل خط وکتابت اور آمدورفت کا سلسلہ شروع ہوگیا جو تقریباً اٹھارہ انیس برس جاری رہ کر ۱۳۶۲ھ میں حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی وفات پر منتہی ہوا۔

حکیم الامتؒ سے گہرا اور طویل تعلق اور اس کے ہمہ گیر اثرات

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں چوتھی حاضری جس کی کچھ تفصیل اوپر بیان ہوئی' درحقیقت یہ حضرت والد صاحبؒ کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز تھا' اس مرتبہ حضرت حکیم الامتؒ سے اصلاح وتربیت کا جو تعلق قائم ہوا یہ اتنا گہرا' ولولہ انگیز' مستحکم اور ہمہ گیر تھا کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کے بعد سے حضرت والد صاحبؒ کی پوری زندگی درحقیقت اسی تعلق کی تفسیر اور اسی ربط پیہم کی داستان ہے' اس داستان کو اگر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ کے حالات زندگی سے الگ کردیا جائے تو یہ ایک دیندار اور ذہین وجفاکش مدرّس ومفتی کے حالات زندگی تو ہوں گے مگر اس جلیل القدر ہستی کے حالات نہ ہوں گے جسے تھانہ بھون کی خانقاہ نے شیخ کامل' پیشوائے دین' صاحب مقامات ولی اللہ' توازن واعتدال کا پیکر اور عظیم محقق وفقیہ بنا کر "مفتی اعظم" کے مقام تک پہنچایا تھا۔ مجدد ملت' حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ ہی کی صحبت وتربیت وہ کیمیا تھی جس نے اس جوہر خالص کو نکھار عطا کیا' اور سونے کو کندن بنادیا۔

لیکن یہ داستان اتنی طویل' مسلسل اور پہلودار ہے کہ زیر تحریر مضمون میں اس کے صرف اشارے ہی آسکیں گے کیونکہ اس داستان کو نہ ایک عنوان کے تحت سمیٹا جاسکتا ہے

نہ پوری ایک تصنیف اس کے لئے کافی ہے' اس کے لئے تو مختلف موضوعات کی نہ جانے کتنی تصنیفوں کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے کہ حضرت والد صاحبؒ کی زندگی کے کئی پہلو ایسے ہیں جن پر الگ الگ تصانیف کی ضرورت ہے اور چوتھی حاضری تھانہ بھون کے بعد حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا کوئی ورق ایسا نہ تھا جس پر خانقاہ تھانہ بھون کی چھاپ موجود نہ ہو' کوئی دلچسپی ایسی نہ تھی جو مرشد تھانویؒ کے مذاق و مزاج میں ڈھلی ہوئی نہ ہو' کوئی مصروفیت ایسی نہ تھی جو خانقاہ تھانہ بھون سے ہم آہنگ نہ ہو' تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں علمی تحقیقات ہوں یا فقہ و فتویٰ کی گتھیاں' باطن کی ریاضتیں ہوں یا ظاہر کی عبادتیں' آخر شب کی خلوتیں ہوں یا وعظ و درس کی جلوتیں' خانگی الجھنیں ہوں یا ملکی و سیاسی پیچیدگیاں' معاشی حالات ہوں یا اولاد اور ان کی شادی بیاہ کے معاملات' عزیزوں دوستوں کی مہربانیاں ہوں یا حاسدوں کی ریشہ دوانیاں' غم کا موقع ہو یا خوشی کا' ہر حال میں مرشد تھانویؒ سے گہرا رابطہ قائم تھا۔

مستقل قیام دیوبند میں تھا' مگر جب بھی دارالعلوم کے مشاغل سے ذرا موقع ملتا' یا حضرت حکیم الامتؒ یاد فرماتے' تھانہ بھون حاضر ہو جاتے۔ کبھی جمعہ کی چھٹی وہاں گزار کر سنیچر کی صبح تک دیوبند واپسی ہو جاتی' کبھی کئی کئی مہینے قیام رہتا' دارالعلوم کی سالانہ تعطیلات میں رمضان کا اکثر و بیشتر پورا ہی مہینہ مع اہل و عیال تھانہ بھون کی روح پرور فضا میں گزرتا۔ جب اہل و عیال ساتھ ہوتے تو سب کا قیام حضرت کے برابر والے مکان میں ہوتا تھا۔

ہم سب بھائیوں کے نام حضرت تھانویؒ نے ہی تجویز فرمائے تھے' احقر کے بڑے بہن بھائیوں کو وہاں کے بہت واقعات یاد ہیں' لیکن ناچیز کی عمر حضرت حکیم الامتؒ کی وفات کے وقت صرف سات برس تھی' وفات کا حادثہ تو بخوبی یاد ہے' حضرت کو حیات میں دیکھا بھی ضرور ہوگا' مگر افسوس کہ نہ دیکھنا یاد رہا نہ شکل مبارک حافظہ میں ہے یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لیتا ہوں کہ۔

ہے یہی کیا کم کہ تھا میں بھی حریم ناز میں
التفات حسن سے بے خود سہی' غافل سہی

اس زمانہ کے کچھ دھندلے سے نقوش یاد رہ گئے ہیں مثلاً ایک مرتبہ حضرت کے برابر

والے مکان میں مجھے کوئی جھولے میں جھلا رہا تھا اور ایک مصرعہ غالباً مجھے والد صاحب ؒ ہی نے یاد کرایا ہوگا میں وہ اکثر پڑھا کرتا تھا اس وقت بھی جھولتے ہوئے خوب مزے لے لے کر پڑھ رہا تھا' مصرعہ یہ تھا۔

اللہ اللہ کا مزا مرشد کے مے خانے میں ہے

اس زمانہ کے تمام حالات احقر کو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اور خاندان وخانقاہ تھانہ بھون کے دوسرے بزرگوں سے معلوم ہوئے ہیں۔

خدمت خلق اور بے نفسی کا ایک سبق آموز واقعہ

سردیوں کی ایک رات میں والد صاحب ؒ بذریعہ ریل تھانہ بھون اسٹیشن پر اترے' برانچ لائن پر یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ جس کا اسٹیشن بھی بہت چھوٹا اور آبادی سے کافی دور ہے۔ راستہ میں کھیت اور غیر آباد زمینیں ہیں وہاں اس زمانے میں بجلی تو تھی ہی نہیں' رات کے وقت قلی یا سواری ملنے کا بھی امکان نہ تھا کیونکہ اس وقت اکا دکا ہی کوئی مسافر آتا جاتا تھا۔ گاڑی دو تین منٹ رک کر روانہ ہوگئی۔ اب اسٹیشن پر ہو کا عالم تھا' ہر طرف جنگل' اندھیری رات اور سناٹا۔ اسٹیشن سے قیام گاہ تک آمدورفت عموماً پیادہ پا ہوتی تھی' والد صاحب ؒ تنہا تھے' سامان بھی ساتھ نہ تھا اس لئے کوئی فکر نہ تھی' اچانک آواز آئی "قلی' قلی"! یہ آواز بار بار آرہی تھی اور اب اس میں گھبراہٹ بھی شامل ہوگئی تھی' کوئی صاحب مع اہل وعیال اسی گاڑی سے اترے تھے' قلی نہیں مل رہا تھا جو آبادی تک سامان پہنچادے' یہ والد صاحب ؒ کے ایک واقف کار تھے اور عقیدت مندانہ ملتے تھے۔ والد صاحب ؒ سے اپنا بوجھ اٹھوانے پر ہرگز راضی نہ ہوتے یا عمر بھر ندامت کے بوجھ میں دبے رہتے۔

حضرت والد صاحب ؒ فرماتے ہیں کہ میں نے جلدی سے سر پر رومال لپیٹ کر اوپر سے چادر ڈالی اور مزدورانہ ہیئت میں تیزی سے پہنچ کر کہا۔ "سامان رکھواؤ کہاں جانا ہے؟" انہوں نے پتہ مختصراً بتاتے ہوئے میرے سر پر سامان لادنا شروع کردیا' پہلا بکس ہی اتنا بھاری تھا کہ میں نے کبھی نہ اٹھایا تھا' اس پر دوسرا بکس رکھا' تیسرا عدد میرے ہاتھ اور بغل میں تھمانا چاہتے تھے میں نے دونوں ہاتھوں سے بمشکل ان بکسوں کو سنبھالتے ہوئے کہا کہ "حضور

میں کمزور آدمی ہوں زیادہ نہیں اٹھا سکتا۔" یہ (تیسرا عدد) آپ سنبھال لیں۔
یہ مختصر قافلہ روانہ ہوا' بوجھ سے پاؤں ڈگمگا رہے تھے مگر میری اس کمزوری کو میری ٹارچ نے چھپا لیا تھا جو انہیں راستہ دکھا رہی تھی اور میری طرف متوجہ ہونے کا موقع نہ دیتی تھی۔ ان کی قیام گاہ پر سامان اتارا' وہ یہ کہہ کر ذرا اندر گئے کہ "ابھی آ کر پیسے دیتے ہیں" میں موقع پا کر وہاں سے غائب ہو گیا۔ اگلے دن وہ صاحب خانقاہ میں حسب سابق بڑی تعظیم سے ملے' مگر انہیں کیا معلوم وہ ایک "قلی" سے مل رہے ہیں۔

افشاء راز

یہ واقعہ والد صاحب نے ہمیشہ راز میں رکھا' حتیٰ کہ جن صاحب کا سامان اٹھایا تھا انہیں بھی عمر بھر معلوم نہ ہو سکا کہ وہ فرشتہ صفت "قلی" کون تھا؟ تقریباً بیس سال بعد ہم سب بھائیوں کے سامنے یہ راز اس طرح کھلا کہ کراچی میں جب احقر کی عمر تقریباً پندرہ سال تھی۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اس زمانہ میں ہماری والدہ صاحبہ مدظلہا کو ہم بھائیوں سے بار بار شکایت پیش آئی کہ وہ گھر کا سودا سلف لانے کے لئے فرماتیں' ہم لڑکپن کی لاپروائی میں ایک دوسرے پر ٹال دیتے۔ والدہ ماجدہ کو اس سے جو تکلیف ہوتی ہوگی' اب اس کے تصور سے بھی ڈر لگتا ہے' انہوں نے کئی بار حضرت والد صاحب کو بھی توجہ دلائی اور شکایت کی کہ یہ لوگ بازار سے سامان لانے میں عار سمجھتے ہیں' اس لئے ٹالتے ہیں' والد صاحب چشم پوشی فرماتے رہے' آپ کی عادت تھی کہ کسی غلطی پر بار بار نہیں ٹوکتے تھے' فہمائش کے لئے زیادہ سے زیادہ موثر موقع کا انتظار فرماتے اور ایسے وقت تنبیہہ فرماتے جب سب کو فراغت اور طبیعتوں میں نشاط ہو' ایک دن ہم سب حضرت والد صاحب کی خدمت میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے' ہماری کسی کسی بات میں وہ بھی دلچسپی لیتے رہے پھر اچانک سنجیدہ ہو گئے اور محترمہ والدہ صاحبہ کی مسلسل پریشانی کا ذکر فرما کر ہماری اس بے پروائی پر شرم دلائی پھر آہ سرد بھر کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ میرا ایک راز جو میرے اور اس کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا' تمہاری اصلاح کے لئے آج وہ اُسے کھولنے کی ضرورت پیش آ گئی' پھر یہ واقعہ سنایا ہم سب پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا اور بحمد اللہ اس گناہ سے توبہ کی توفیق ہوئی۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ

اسی موقع پر ایک اور واقعہ بھی سنایا کہ "میں دیوبند میں ایک دن نماز فجر کے لئے جا رہا تھا' سامنے ایک بہت ہی ضعیف بڑی بی کو دیکھا جو پانی کا گھڑا کنویں سے بھر کر لا رہی تھیں مگر اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا' بمشکل چند قدم چل کر زمین پر بیٹھ جاتی تھیں' مجھ سے دیکھا نہ گیا' پاس جا کر کہا "لاؤ اماں یہ گھڑا تمہارے گھر پہنچادوں۔" یہ کہہ کر میں نے گھڑا اٹھالیا' وہ جولاہوں کے محلہ میں رہتی اور اسی برادری سے تعلق رکھتی تھیں' جب میں گھڑا بڑی بی کے گھر میں رکھ کر باہر نکلا تو وہ نہایت لجاجت اور الحاح کے ساتھ دعائیں دینے لگیں جو مجھے کافی آگے تک سنائی دیتی رہیں' اگلے دن پھر اسی وقت اور اسی حال میں ملیں' میں نے گھڑا اٹھا کر ان کے گھر پہنچادیا' واپسی پر دور تک پھر ان کی دعائیں سنتا رہا' میں نے یہ سوچ کر کہ یہ سودا تو بڑا سستا ہے کہ چند منٹ کی محنت پر اتنی دعائیں ملتی ہیں' میں نے روز کا یہی معمول بنالیا۔ بڑی بی بھی اس کی عادی ہو گئیں' اب میں کنویں پر ہی پہنچنے کی کوشش کرتا تھا تاکہ انہیں ڈول بھی کھینچنا نہ پڑے' بحمد اللہ یہ معمول عرصہ دراز تک جاری رہا' یہاں تک کہ بڑی بی نے ہی آنا چھوڑ دیا' شاید ان کا انتقال ہو گیا تھا۔" پھر فرمایا کہ یہ واقعہ بھی آج پہلی بار تم ہی کو بتا رہا ہوں تاکہ کچھ سبق حاصل کرو۔

حضرت والد صاحبؒ کی بے نفسی اور للّٰہیت' تواضع و مسکنت اور ایثار و فنائیت ہی وہ اصل دولت تھی جسے حضرت شیخ الہندؒ کی صحبتوں نے نکھارا تھا اور اب حکیم الامتؒ کی رہبری میں ان کی عملی مشق ہو رہی تھی' حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ :

"بزرگ بننا ہو' قطب بننا ہو' غوث بننا ہو تو کہیں اور جاؤ اور انسان بننا ہو تو یہاں آؤ۔"[1]

---

[1] مآثر حکیم الامت" ص ۱۲۶ (طبع سوم) یہ کتاب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ' مجاز اور احقر کے شیخ و مربی۔ سیدی و سندی حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفی مد ظلہم کی ایک انوکھی تالیف ہے' جس کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ دوسری سوانح کی طرح یہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے تاریخی حالات پر نہیں بلکہ آپ کے مزاج و مذاق' مسلک و مشرب' شان تربیت اور انداز زندگی کی نہایت جامع اور دلکش تصویر ہے۔ شاید ہی کسی نے باریک باریک جزئیات کی تصویر کشی ایسے دلنشیں انداز میں کسی کی

(باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

اس خانقاہ میں پہلا سبق ہی یہ دیا جاتا تھا کہ :

"پہلے آدمی بنو کیا بزرگی اور ولایت ڈھونڈتے پھرتے ہو' آدمیت سیکھو' بزرگی بچاری تو ایک دن میں ساتھ ہو لیتی ہے' مشکل چیز تو شرافت اور شعور انسانیت ہے[1]"

کیفیات 'مکاشفات' ذوقیات' کرامات اور تصرفات کو تو چھوڑیئے ایک درجہ میں حضرت تھانویؒ ان کو تو اہمیت دینے کے مخالف ہی رہے مگر معمولات یومیہ مثلاً تہجد' نوافل' ذکر و اذکار' اور اوراد و وظائف جو مستحبات کے قبیل سے ہیں ان کے چھوٹ جانے پر بھی کسی سالک پر کبھی چیں بہ جبیں نہ ہوتے تھے' کسی عذر شرعی سے معمولات چھوٹ جانے پر کبھی مواخذہ نہ فرماتے تھے لیکن اگر کوئی بے اصولی بات کرتا یا بے فکری کا ثبوت دیتا جو حقوق شریعت نے واجب کئے ہیں ان کا تارک ہوتا' معاملات میں بدانتظامی برتتا' یا سلیقہ اور ڈھنگ سے کام نہ لیتا یا ناحق کسی کی ناگواری کا باعث ہوتا تو حضرت فوراً تیور بدل لیتے' سخت اور تیز لہجہ بنا لیتے اور فوراً اصلاح فرماتے۔ تمام اہل مجلس کو عموماً اور سالکین کو خصوصاً اس طرف توجہ دلاتے کہ :

"یہ تمام چیزیں' دوسروں کی اذیت کا سبب بنتی ہیں اور اذیت نہ پہنچانا واجب ہے اور تم سب اس کے مکلف ہو[2]"

حقوق العباد اور آداب معاشرت کی اہمیت جو لوگوں نے فراموش کردی تھی اس کی تلقین و تاکید میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ فرماتے ۔ آپ کی تعلیم و تربیت کا یہ انداز ہر مجلس اور ہر تحریر و تقریر میں رچا بسا تھا۔

بھائی جان کے نام حکیم الامتؒ کا گرامی نامہ

اس کی ایک ہلکی سے جھلک اس نامہ مبارک میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جو احقر کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

سوانح میں کی ہو جیسی اس میں کی گئی ہے' انداز بیان ایسی محویت پیدا کرتا ہے کہ کتاب شروع کر کے ختم کئے بغیر چین نہیں آتا اور ختم کتاب کے بعد اطمینان اور تڑپ کی جو متضاد کیفیات دل میں پیدا ہوتی ہیں وہی حاصل کتاب اور مقصود زندگی ہے۔ اطمینان اس بات کا کہ راہ مستقیم مل گئی اور تڑپ اس راہ مستقیم پر چلنے کی جو زندگی کو لازوال زندگی عطا کرتی ہے۔

[1] حوالہ بالا   [2] حوالہ بالا ص ۱۲۷۔

بھائی جان (جناب مولانا محمد زکی صاحب مرحوم) کے ایک خط کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ ہم سب بھائیوں میں وہی سب سے بڑے تھے اور حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں رہنے کا سب سے زیادہ موقع انہی کو میسر ہوا۔ بچپن ہی سے والد ماجدؒ کے ساتھ تھانہ بھون جا کر طویل طویل قیام فرماتے تھے۔ حضرت تھانویؒ سے انہوں نے "پند نامہ" پڑھنے کی سعادت حاصل کی تھی اور بیعت بھی ہوئے تھے۔ بچپن میں جب لکھنا بھی پوری طرح نہ سیکھا تھا حضرت کو دیوبند سے ایک خط لکھا جو شاید ان کی زندگی کا پہلا ہی خط ہوگا۔ حضرت حکیم الامت رحمتہ اللہ علیہ نے جو جواب تحریر فرمایا یہاں بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے :

"برخوردار سلمہ   السلام علیکم مع الدعاء

تمہارے حروف دیکھ کر دل خوش ہوا، تمہارے لئے علمی و عملی ترقی کی دعاء کرتا ہوں خط ذرا اور صاف کرلو اس سے مکتوب الیہ کو بھی سہولت و راحت ہوتی ہے۔ اس نیت سے ثواب بھی ملتا ہے۔ دیکھو میں تم کو بچپن ہی سے صوفی بنا رہا ہوں درد سر کا یہ تعویذ سر میں باندھ لو۔ سب گھر والوں کو سلام و دعا[1]..... اشرف علی۔

حضرت حکیم الامت رحمتہ اللہ علیہ کے یہاں تصوف و سلوک کا حاصل ہی یہ تھا کہ:

"فرائض و واجبات ادا ہوجائیں، احکام الٰہیہ کی تعمیل ہوجائے حقوق العباد کی اہمیت واضح ہوجائے بس۔ اگر درویشی کا حاصل یہ ہے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ نہیں[2]۔"

حضرتؒ فرماتے تھے کہ :

"ہم لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے تعلق اور بندگی کا یہ راز بتایا تھا کہ دیکھو اپنی روزمرہ کی زندگی میں یہ کرنا اور یہ نہ کرنا، یہ بات ہم کو پسند ہے اور یہ ناپسند، یہ چیز حلال ہے اور یہ حرام، یہ چیز پاک ہے اور یہ ناپاک، دیکھو اگر تم یہ چاہتے ہو کہ ہم سے صحیح تعلق پیدا کرو ہماری معرفت حاصل کرو اور ہماری محبت سے سرشار ہو تو پھر ہمارے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کامل کرو، پھر تو ہم خود ہی تم سے محبت کرنے لگیں گے، بتاؤ اس سے زیادہ بڑی نعمت و دولت تم اور کیا چاہتے ہو[3]۔"

---

[1] مکاتیب حکیم الامتؒ (قلمی غیر مطبوعہ) ص ۲۳۱

[2] مآثر حکیم الامتؒ ص ۱۲۹

[3] مآثر حکیم الامتؒ ص ۱۲۸

فرماتے تھے کہ :

"دین متین ہی کے ظاہر و باطن کا نام شریعت و طریقت ہے۔ جس طرح ظاہری اعمال کے لئے احکام الٰہیہ فرائض و واجبات ہیں 'اسی طرح باطنی اعمال کے لئے بھی ہیں اور ہم دونوں کے ادا کرنے کے مکلف ہیں[1]"

مجالس حکیم الامت رح

حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے یہاں جو مجلس روزانہ ہوا کرتی تھی 'ظاہر و باطن کی اصلاح میں اس کی تاثیر معروف و مشہور ہے۔ جب حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا قیام تھانہ بھون میں ہوتا تو مجلس خاص اور مجلس عام دونوں میں نہایت اہتمام سے شریک ہوتے' حاضرین مجلس میں متعدد حضرات حکیم الامت رح کے ملفوظات بروقت قلمبند کرلیا کرتے تھے جو حضرت رح کے ملاحظہ کے بعد شائع بھی ہوتے رہتے تھے۔

میرے استاد محترم حضرت مولانا اکبر علی صاحب[2] رح جن کو ان مجالس میں حاضری کے بہت مواقع ملے تھے انہوں نے حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ایک روز بتایا کہ حکیم الامت رح مجلس میں حضرت مفتی صاحب رح کو اپنے قریب بٹھایا کرتے تھے اور جب حضرت کچھ بیان فرما رہے ہوتے تو مفتی صاحب کی محویت کا عالم قابل دید ہوتا تھا' وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہمہ تن صرف حضرت رح کی طرف متوجہ رہتے اور حضرت کے ہر لفظ اور آواز کے ہر اتار چڑھاؤ پر مفتی صاحب کے چہرے اور جسم پر تاثرات ظاہر ہوتے' بے تاب ہو کر بار بار پہلو بدلتے اور کبھی کبھی اس عالم محویت میں سرشار ہو جاتے' ایسا معلوم ہوتا کہ حضرت رح کے ایک ایک لفظ 'اس کے لہجہ اور کیفیت اور معنویت کو لوح قلب پر کندہ ہی نہیں کر رہے بلکہ اپنے رگ و پے میں سمو دینے کے لئے بے تاب ہیں۔

یہی محویت تھی جس کے باعث حضرت والد صاحب رح نے ان ملفوظات کو قلمبند کرنے کا خصوصی اہتمام نہیں فرمایا' جہاں ایک ایک لفظ قلب پر کندہ اور رگ رگ میں اس طرح

---

[1] حوالہ بالا ص ۱۲۸ تا ص ۱۲۹ (طبع سوم)

[2] حضرت مولانا کی وفات شوال ۱۳۹۷ھ میں ہوئی' دارالعلوم کراچی کے قبرستان میں مزار ہے۔

جذب کیا جارہا ہو وہاں کاغذ اور قلم کا گذر ہو تو کیسے ہو؟ اور جو ملفوظات اس کے باوجود قلمبند کرلئے تعجب ہوتا ہے کہ کیسے کرلئے اور کتنے ضروری سمجھ کر کئے ہوں گے۔ چنانچہ حضرت والد صاحبؒ نے اپنی کتاب "مجالس حکیم الامت" کے مقدمہ میں اتنا تو خود بھی لکھ دیا ہے کہ:

"اس ناکارہ کو اس کی ہمت بہت کم ہوتی تھی کہ مجلس میں بیٹھ کر لکھنے کی طرف توجہ دے' اس لئے اس کا اہتمام تو نہیں تھا مگر خاص خاص باتیں اپنی یادداشت کے لئے لکھ بھی لیتا تھا' اس طرح لکھا ہوا بھی ایک اچھا خاصہ ذخیرہ جمع ہوگیا تھا۔"

پھر جب یہی گراں بہا ذخیرہ ۱۹۷۴ء میں کراچی سے شائع ہوا تو یہ بھی تین سو پچپن صفحات پر مشتمل تھا۔ علوم و معارف' اشعار و لطائف' حقائق و مسائل' حکایات و روایات' فقہ و تصوف اور آداب زندگی کا ایسا رنگ برنگ مہکتا ہوا گلشن ہے کہ

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

مکاتیب حکیم الامتؒ

پیچھے عرض ہوچکا ہے کہ چوتھی حاضری تھانہ بھون کے بعد سے حضرت حکیم الامتؒ کی ذات گرامی ہی والد ماجدؒ کے تمام مشاغل اور دلچسپیوں کا مرکز بن گئی تھی' جو زمانہ دیوبند میں گذرتا' اور وہاں جو جو حالات پیش آتے ان سب میں بذریعہ خط و کتابت تھانہ بھون سے رابطہ قائم رہتا' اپنے ایک ایک حال کی اطلاع لکھ کر مرشد تھانویؒ سے ہدایات حاصل کی جاتیں' چار پانچ روز میں جواب آجاتا تھا۔ اصلاحی تعلق رکھنے والے حضرات کے لئے خانقاہ تھانہ بھون کا اصول ہی "اطلاع اور اتباع" تھا۔ یعنی وہ اپنے احوال کی اطلاع حضرتؒ کو دیں اور حضرتؒ جو ہدایات ارشاد فرمائیں ان کے مطابق عمل کیا جائے اس اصول کی کم و بیش سب ہی پابندی فرماتے تھے حتیٰ کہ بعض اوقات صرف اتنا ہی لکھ بھیجتے کہ کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے مثلاً والد ماجدؒ نے ۱۰ محرم ۱۳۴۶ھ کو خط لکھا کہ:

"اکثر طبیعت چاہتی ہے کہ کوئی عریضہ ارسال خدمت کروں لیکن پھر سوچتا ہوں کہ کیا

لکھوں؟ کیونکہ کوئی حال ہو تو لکھا جائے لیکن یہ خیال ہوتا ہے کہ اس "بے حالی" ہی کی اطلاع دوں۔"

جواب آیا کہ :

"یہی چاہیے' انشاء اللہ تعالیٰ نفع سے خالی نہیں۔"

اس طریق کار کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرت حکیم الامتؒ کے پاس روزانہ ڈاک کا اچھا خاصا انبار پہنچتا تھا' جس میں پیچیدہ فقہی سوالات' باطنی اصلاح کے متعلق نازک مسائل' روزمرہ کے معاملات زندگی میں مشورے اور ملکی و اجتماعی مہمات میں تبادلہ خیالات' سب ہی کچھ ہوتا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ حضرت حکیم الامتؒ اپنے ہمہ گیر مشاغل کے باوجود ڈاک کا جواب روز کے روز بھیج دیا کرتے تھے۔ خط روانہ کرنے کے بعد طالبین یقین سے بتا سکتے تھے کہ فلاں دن جواب آجائے گا اور ایسا ہی ہوتا تھا۔

طریقہ خط و کتابت کا یہ تھا کہ کاغذ میں دو کالم مقرر کر کے طالبین ایک کالم میں خط لکھتے تھے اور دوسرا کالم جو اسی کے مقابل ہوتا تھا حضرت حکیم الامتؒ کے جواب کے لئے سادہ چھوڑ دیا جاتا تھا' حضرت جس جملہ کا جواب دینا مناسب سمجھتے تھے اسی کے سامنے سادہ کالم میں لکھ دیتے' کبھی جواب میں طویل مضمون لکھنا ہوتا تو آخر میں یا الگ کاغذ پر بھی تحریر فرمادیتے' پھر اصل خط مع جواب کے صاحب خط کے پاس واپس بھیج دیا جاتا تھا۔ اس طرح طالبین کے پاس اپنا خط اور حضرت کا جواب دونوں محفوظ ہو جاتے تھے۔

والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ کی خط و کتابت حضرت حکیم الامتؒ سے اگرچہ ۱۳۳۷ھ میں شروع ہو گئی تھی لیکن اس میں نہ تسلسل اس وقت قائم رہ سکا نہ وہ محفوظ رکھی جا سکی سوائے ایک کارڈ کے جو ۱۳۳۸ھ کا ہے لیکن چوتھی حاضری تھانہ بھون کے بعد ۲۰ رمضان ۱۳۴۴ھ سے پوری خط و کتابت کو والد صاحبؒ نے نہایت اہتمام سے محفوظ فرما رکھا تھا جو ۱۳۶۲ھ میں حضرت حکیم الامتؒ کی وفات تک برابر جاری رہی۔

اس پوری خط و کتابت کو والد ماجدؒ نے فل اسکیپ سائز کے ایک ضخیم رجسٹر میں جو ۲۴۶ صفحات پر مشتمل ہے ترتیب سے نقل کرالیا تھا۔ یہ صرف اپنی یادداشت کے لئے تھا' اشاعت کا ارادہ نہ تھا' چنانچہ ۱۳۵۸ھ میں یہ وصیت بھی تحریر فرمادی تھی کہ "۱ سے کوئی شائع نہ کرے "۱ اور اس کی "اصل اور بڑی وجہ" یہ تحریر فرمائی تھی کہ :

"ان (خطوط) کا تعلق احقر کے شخصی حالات سے ہے میں کیا اور میرے حالات کیا، جن سے کسی کو کوئی فائدہ پہنچے اور جواب کا سوال پر مرتب ہونا ظاہر ہے اس کے علاوہ کچھ اور وجوہ بھی اشاعت سے مانع محسوس ہوتی تھیں[1]"

مگر یہ والد صاحب کی محض تواضع تھی ورنہ واقعہ یہ ہے کہ یہ خط و کتابت نہ صرف والد صاحب کے ہر شعبہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے بلکہ اصول دین، شریعت و طریقت، حقوق العباد، اور آداب زندگی کا گراں بہا نادر ہدایت نامہ اور حکیم الامت کے برسہا برس کے تجربات کا نچوڑ ہے، ساتھ ہی سوزو عشق اور شعرو ادب کی چاشنی نے اس کے کیف کو دوبالا کردیا ہے۔ مجھ جیسا کور ذوق بھی ان خطوط کو پڑھ کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ ؎

ساقی ترا مستی سے کیا حال ہوا ہو گا
جب تونے یہ مے ظالم شیشے میں بھری ہوگی

مسلمانوں کے لئے اس کی عظیم افادیت کے پیش نظر متعدد مخلصین نے حضرت والد صاحب کو بمشکل اس کی اشاعت پر آمادہ کیا تو ۱۳۹۳ھ میں آپ نے اس پر انتخاب و تلخیص کے لئے نظر ثانی فرمائی اور کل ۲۷۵ خطوط میں سے تقریباً نصف پر نشان لگادیا کہ یہ شائع نہ کئے جائیں باقی ۱۴۸ خطوط کو اشاعت کے لئے منتخب فرما کر شروع میں ایک مقدمہ تحریر فرمایا اور کتاب کا نام "مکاتیب حکیم الامت" تجویز فرمایا۔ افسوس کہ اپنی حیات میں شائع نہ فرما سکے، انشاء اللہ العزیز اب عنقریب اس کی اشاعت کا بندوبست کیا جائے گا۔

یہاں بطور نمونہ چند خطوط کسی خاص ترتیب کے بغیر ہدیہ ناظرین ہیں۔

رسالہ سیرت خاتم الانبیاء کے متعلق

مکتوب......۲۰ رمضان ۱۳۴۴ھ

مکتوب : رسالہ ہذا (یعنی اوجز السیر لخیر البشر[2]) جو حال میں احقر نے سیرت نبی کریم صلی

---

[1] مقدمہ مکاتیب حکیم الامت ص ۵ (قلمی غیر مطبوعہ)

[2] یہ رسالہ کا عربی نام ہے، اب سالہا سال سے اس کا نام "سیرت خاتم الانبیاء" مشہور ہو گیا ہے اور اسی نام سے طبع ہوتا ہے (رفیع)

اللہ علیہ وسلم کے متعلق مختصر انداز میں لکھا ہے ارسال خدمت ہے امید ہے کہ ملاحظہ فرماکر قابل اصلاح امور سے احقر کو مطلع فرمائیں گے تاکہ آئندہ طباعت میں تصحیح کر دی جائے نیز اگر حضرت مناسب خیال فرمائیں تو چند سطریں بطور تقریظ تحریر فرمادیں۔"

جواب : از احقر اردو الخلائق اشرف علی عفی عنہ السلام علیکم

جواب میں دیر اس لئے ہوئی کہ شروع کر کے چھوڑنے کو جی نہ چاہا اور فرصت ہوتی نہیں' اس لئے جب سب دیکھ لیا اس وقت جواب لکھا' آپ کے جواب کے لئے ٹکٹ کا مطلق انتظار نہ تھا' رسالہ دیکھ کر جیسے خوشی ہوئی ہے اس کی حد تو کیا بیان کروں' بجائے حد بیان کرنے کے یہ دعا دیتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ایسی ہی خوشی اس کی جزاء سے آپ کو دے' میں نے جو کچھ اس کے متعلق لکھا ہے[1] اس میں ایک حرف بھی تکلف سے نہیں لکھا گیا اس سے زائد میرے مذاق کے خلاف ہے اگر پسند ہو شائع کرنے کی اجازت ہے......... اشرف علی

حضرت حکیم الامت ؒ نے اس خط کے علاوہ تقریظ بھی الگ لکھ کر روانہ فرمائی' جس میں اپنی مسرت اور غیر معمولی پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور اس کے آخر میں یہ بھی تحریر فرمایا کہ "بہرحال رسالہ ہر پہلو سے محبوب و دلکش اور اپنے مؤلف کے کمالات کا روشن آئینہ ہے اب اس کو ختم کر کے جازم رائے دیتا ہوں کہ اس کے درس سے کسی کو خالی نہ چھوڑا جائے اور میرے مشورہ سے جو اس رائے کو قبول کریں گے ان سب سے پہلے مؤلف سلّمہٗ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کی دس جلدوں کا ویلو "وی پی" میرے نام کردیں جن میں سے ایک تو آچکا ہے نو اور بھیج دیں تاکہ میں اپنے خاندان کے بچوں اور عورتوں کو پڑھنے کے لئے دوں۔ والسلام"

از تھانہ بھون ۲۰ رمضان المبارک ۴۴ھ

حضرت والد صاحب ؒ نے کتاب کے دس نسخے حسب الحکم روانہ کئے تو سخت فکر ہوئی کہ حکم تو ویلو (وی پی) کرنے کا ہے' دل یہ چاہتا تھا کہ بطور ہدیہ پیش کریں جب کچھ سمجھ میں

---

[1] تقریظ الگ لکھ کر اسی لفافے میں ارسال فرمائی تھی' یہ اسی کے متعلق ارشاد ہے' یہ تقریظ رسالہ خاتم الانبیاء کے ساتھ طبع ہو چکی ہے (رفیع)

نہ آیا تو بغیر ویلو کے کتابوں کا پارسل بھیج دیا اور اپنی حیرانی علیحدہ خط میں لکھ دی[1] جس کے جواب میں حضرت اقدس نے کتابوں کی نصف قیمت کا منی آرڈر فرمایا کوپن میں یہ مضمون تحریر تھا:

"مشفقم جامع الکمالات۔ زید فضلہ السلام علیکم

پارسل دس نسخہ کا مع محبت نامہ پہنچا، جیسے آپ فکر میں رہے کہ قیمت لوں یا نہ لوں؟ میں آپ کی تحریر دیکھ کر فکر میں پڑگیا کہ قیمت دوں یا نہ دوں؟ اور کئی روز اسی سوچ میں لگ گئے، بالآخر دونوں جہت یعنی ہدیہ و بیع کا لحاظ کرکے نصف قیمت بھیجنا اعدل الطرق معلوم ہوا۔ امید ہے کہ بے تکلف قبول فرمالیں گے جب کہ میں نے نصف بے تکلف لے لیا۔ اشرف علی تھانہ بھون۔"

دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی سال کے آغاز پر

مکتوب......۲۴ شوال ۴۴ھ

مکتوب: "اسباق[2] شروع کرنے سے پہلے حضرت سے استدعا ہے کہ برکت فی العلم والعمل اور حقوق کتاب اور طلباء کے کماحقہ ادا ہونے کے لئے دعاء سے سرفراز فرمائیں گے۔"

جواب: "دل سے دعا کرتا ہوں اور کیوں نہ کرتا جب دل اندر سے خوش ہو اللہ تعالیٰ برکات اضعافا مضاعفہ فرمادے۔

مکتوب: اب اس سال میں نظام الاوقات اس طرح رکھنے کا خیال ہے یا جس طرح حضرت فرمائیں اس کی تعمیل کروں۔ ہدایہ چونکہ عموماً گھنٹہ کے سبق میں ناتمام رہ جاتی ہے اس لئے خیال ہے کہ بعد نماز صبح گھنٹہ سے پہلے ہدایہ کتاب النکاح سے اور گھنٹہ میں ابتداء

---

[1] مکاتیب حکیم الامت" ص ۲ (قلمی)

[2] دارالعلوم کا تعلیمی سال شوال سے شروع ہوتا ہے اور اسباق کا آغاز حسب معمول اواخر شوال میں ہوتا تھا وہ مراد ہے (رفیع)

سے پڑھاؤں' پہلے گھنٹہ میں ہدایہ دوسرے میں مطالعہ ہدایہ اور تیسرے میں مشق تحریر عربی اور چوتھے میں مقامات' اس کے بعد دوپہر کو ڈیڑھ دو گھنٹہ اپنا تجارتی کام[1] اور ایک گھنٹہ قیلولہ اور بعد نماز ظہر تلاوت ایک پارہ قرآن مجید' اس کے بعد ایک گھنٹہ تک کوئی رسالہ یا مضمون لکھنا' پھر ایک گھنٹہ سبق حماسہ' نماز عصر کے بعد بطور تفریح باہر جانا' بعد المغرب حسب الارشاد ذکر اسم ذات جواب بارہ تسبیح تک التزاماً ہو جاتا ہے اور کبھی کچھ زائد بھی' بعد نماز عشاء مطالعہ کتب۔

"اس میں جو حذف و ازدیاد حضرت مناسب سمجھیں' انشاء اللہ اس کی تعمیل کروں گا۔"

جواب : "ان امور میں حسب اصل امام ہمام رائی مبتلی بہ ہی اصل ہے کہ چار روز میں تجربہ سے بقایا تغیر کا فیصلہ ہو جائے گا۔"

مکتوب : "طبیعت چاہتی ہے کہ شیئی من اللہ لحۃ (تھوڑا سا وقت آخر شب کا) بھی نصیب ہو لیکن آنکھ نہیں کھلتی' اگر کبھی کھل جاتی ہے تو کسل اتنا غالب کہ اٹھنا بھی بے سود سا معلوم ہوتا ہے اس لئے اس وقت تک چار رکعت بہ نیت تہجد مابین سنت عشاء اور وتر کے پڑھ لیتا ہوں لیکن طبیعت یہی چاہتی ہے کہ آخر رات کا کوئی حصہ مل جائے۔"

جواب : "تہجد تو بعد نماز عشاء ہی پڑھ لیا کیجئے لیکن اگر آخر میں آنکھ کھل جاوے تو بستر پر بیٹھ کر کچھ اسم ذات جب تک بیٹھنے کی ہمت ہو پڑھ لیا کیجئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس سے راہ نکلے گی۔"

سب سے پہلے صاحبزادے کا انتقال اور ایک خواب

مکتوب .... ۷ صفر ۴۵ھ

مکتوب : "انہی ایام میں احقر کا بڑا لڑکا محمد مشفع نامی جو عرصہ سے بیمار تھا' انتقال کر گیا

---

[1] ایک تجارتی کتب خانہ بنام دارالاشاعت اس زمانہ میں آپ نے قائم کیا ہوا تھا۔ اس کا سب کام اول سے آخر تک آپ خود ہی انجام دیتے' انشاء اللہ آگے کسی موقع پر اس کا بیان ہو گا (رفیع)

میرے ساتھ خصوصاً زیادہ مانوس تھا اس لئے زیادہ پریشانی کا باعث ہوا"

جواب : "انا للہ۔ اللہ تعالیٰ صبرو اجر و نعم البدل عطا فرمائے۔

مکتوب : انہی ایام میں احقر نے دو خواب[1] دیکھے تھے امید ہے کہ ان کی تعبیر سے مطلع فرمایا جائے گا۔"

"ایک رات میں نے دیکھا کہ میں کسی باغ میں ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی جہاد سے واپسی ہوئی ہے اور میں ایک طرف جا کر باغ کے کنارے پر دم لینے کے لئے بیٹھ گیا ہوں۔ اسی عرصہ میں سامنے سے ایک شخص پہنچتا ہے جو ارباب مدرسہ اور بالخصوص مولانا حبیب[2] الرحمٰن صاحب کا بھیجا ہوا ہے کہ چلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو اس میدان میں تشریف فرما ہیں تمہیں طلب فرماتے ہیں اور راستہ ہی میں یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی اور جہاد کی تیاری ہے اور مجھے بھی اسی لئے طلب فرمایا گیا ہے اور کچھ لوگ میرے عمل کی تحسین بھی کر رہے ہیں کہ ابھی تو ایک جہاد سے فارغ ہوا تھا اور ابھی دوسرے کے لئے مستعد ہو گیا' میں راستہ ہی میں تھا کہ میری آنکھ کھل گئی اور زیارت سے مشرف نہ ہونے کا سخت افسوس رہا۔"

جواب : "انشاء اللہ تعالیٰ آپ کو دینی خدمات کی توفیق عطا ہوگی اور وہ نافع بھی ہوگی۔"

رسالہ ختم نبوت کے متعلق

مکتوب...... ۱۰ محرم ۴۶ھ

مکتوب : احقر کے رسالہ "ختم نبوت" کا تیسرا حصہ چھپنے سے باقی تھا حال میں تیار ہو کر آیا ہے جس کا ایک نسخہ بذریعہ ڈاک ارسال خدمت کیا ہے امید ہے کہ ملاحظہ سے مشرف فرمایا جائے گا نیز جو بات قابل اصلاح نظر آئے' اس پر نشان فرمایا جائے گا۔

---

[1] یہاں صرف ایک خواب ذکر کیا جا رہا ہے۔ دوسرا خواب برادر عزیز مولانا محمد تقی صاحب نے البلاغ کے مفتی اعظم نمبر میں اپنے ایک مضمون میں نقل کر دیا ہے (رفیع)

[2] جو اس وقت دار العلوم دیوبند کے مہتمم تھے۔

جواب : ؎

دوست نہ بیند بجز آں یک ہنر

مجھ کو تو سب خوبیاں ہی نظر آئیں۔

مکتوب : نیز اگر بار خاطر عاطر نہ ہو اور وقت میں گنجائش ہو تو چند سطریں بطور تقریظ بھی تحریر فرمادی جائیں تو میرے لئے تبرک اور رسالہ کے فوائد میں تضاعف کا سبب ہوگا۔

جواب : بلا شائبہ تکلف کہتا ہوں کہ ارادہ یہ تھا کہ اول سے تھوڑا سا حصہ دیکھ کر باقی کو اس پر قیاس کر کے کچھ لکھ دوں گا مگر دیکھنا جو شروع کیا تو حظ پر حظ بڑھتا گیا جس نے رسالہ ختم ہی کرا کے چھوڑا 'ماشاء اللہ ہر پہلو سے کافی ہے خصوص جہاد میلہ سے جو استدلال کی تقریر کی ہے عجیب اور بے نظیر ہے کہ طالب حق کے لئے تو سب دلائل سے مغنی ہے پھر مرزا کے شبہات کا جواب دیکھ کر تو علوم سلف کا لطف آگیا کہ قوت کے ساتھ سادگی اور بے تکلفی کو جمع کر دیا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔ اس طرز کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے آپ سے مسلمانوں کو انشاء اللہ تعالیٰ بہت نفع ہوگا یہی بچی عبارت کافی تقریظ ہے۔ اشرف علی ۱۵ محرم ۴۶ھ

عجب اور ریاء؟

مکتوب......۹ جمادی الثانیہ ۴۶ھ

مکتوب : "یہ ناکارہ خادم خدمت اقدس سے رخصت ہو کر دیوبند پہنچا۔"

جواب : "الحمد للہ"

مکتوب : اذکار و اشغال و نماز وغیرہ میں دل نہ لگنے کی جو شکایت بوقت حاضری حضرت سے کی تھی وہ الحمد للہ کہ حضرت کے فیض صحبت سے تقریباً رفع ہو گئی۔

شکر فیض تو چمن کند اے ابر بہار

کہ اگر خار و گر گل ہمہ پروردہ تست

بحمد اللہ اب نماز و ذکر میں طبیعت لگتی ہے آخر شب میں بھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ طمانیت

نصیب ہو جاتی ہے۔

جواب : مبارک ہو

مکتوب : لیکن دن بھر ایک کیفیت مسرت کی سی رہتی ہے جس میں مجھے تمیز نہیں ہوتا کہ یہ "اعجاب[1] بالعبادۃ" ہے یا طاعات کے لازمی آثار میں سے ہے؟

جواب : تلک عاجل بشری المومن[2] ۔ اعجاب امر اختیاری ہے اور یہ غیر اختیاری ہے۔ سو اعجاب ہونے کا احتمال بھی نہیں۔

مکتوب : نیز آثار عبادت کے ظہور سے دل خوش ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ریا ہے؟

جواب : اس میں بھی وہی فیصلہ ہے۔

والد ماجدؒ کا قیام جب تھانہ بھون میں ہوتا وہاں بھی اپنے حالات خط میں لکھ کر حضرت کی خدمت میں پیش فرماتے اور حضرت اس کا جواب تحریر فرماتے' آنے والے دو خط بھی تھانہ بھون کے دوران قیام لکھے گئے ہیں۔

معمولات رمضان و حاشیہ نفحۃ الیمن

مکتوب......... رمضان ۴۶ھ

مکتوب : بالفعل احقر کا وظیفہ حسب ذیل ہے۔ آخر شب میں چار رکعت یا آٹھ رکعتیں تہجد اور اس کے بعد ذکر اسم ذات بضرب و جہر خفیف بارہ سو مرتبہ پھر بعد نماز صبح تسبیح' تحمید' تکبیر' استغفار' صلوٰۃ' ہر ایک صد بار طلوع آفتاب تک پڑھنے کے بعد چار رکعت ضحیٰ' اور پھر ایک پارہ تلاوت قرآن مجید' اسکے بعد تحشیۂ[3] نفحۃ الیمن' اس کے بعد قیلولہ' اور پھر نماز ظہر

---

[1] عبادت کی وجہ سے خود پسندی' جو شرعاً مذموم ہے۔

[2] یہ جملہ حدیث شریف کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تو مومن کے لئے نقد بشارت ہے۔

[3] یعنی حاشیہ لکھنا' نفحۃ الیمن عربی ادب کی مشہور درسی کتاب ہے جس پر عربی حاشیہ والد ماجدؒ نے اسی زمانے میں تحریر فرمایا تھا جو بار بار شائع ہوا (رفیع)

اور تاعصر حاضریٔ خدمت عالی، عصر کے بعد الحزب الاعظم، پھر مغرب کے بعد ایک ہزار مرتبہ ذکر اسم ذات بہ ضرب وجہر خفیف، پھر نماز عشاء اور اس کے بعد سونا،

اس میں حضرت جو ترمیم فرمائیں اس کی تعمیل انشاء اللہ بدل وجاں کروں گا۔

وبیدہ التوفیق وعلیہ التکلان

جواب : سب کافی وافی ہے، صرف دو امر قابل توجہ ہیں ایک چلتے پھرتے کوئی ذکر فی افضلہ لا الٰہ الا اللہ دوسرے تلاوت میں بقدر امکان کچھ بیشی کہ رمضان میں خصوصاً زیادہ موجب برکت ہے۔

شب و روز کے معمولات قارئین کے سامنے ہیں کہ کوئی وقت ذکر و عبادت اور تصنیف وتعلّم سے خالی نہیں اور محض اسی دھن میں گھر کا آرام و راحت چھوڑ کر رمضان خانقاہ تھانہ بھون میں گزار رہے ہیں مگر اس پر بھی دل کی حسرت قابل دید ہے، ملاحظہ ہو اگلا مکتوب۔

مکتوب........رمضان

مکتوب : اہل ذکر عموماً اپنے احوال کی اطلاع حضرت کو دیتے رہتے ہیں یہ ناکارہ خلائق اپنی بے حسی اور بے حالی کے باعث اس سے بھی محروم ہے۔ کل حضرت کی تقریر میں یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی حال نہ ہو تو اس کی اطلاع دینی چاہئے اس لئے گزارش ہے کہ میرا حال زار یہ ہے کہ

شعبان بگذشت و ایں دل زار ہماں
رمضان بگذشت و ایں دل زار ہماں
نہ گلم نہ یاسمینم نہ درخت سایہ دارم
درحیرتم کہ دہقان بچہ کار کشت مارا؟

البتہ حضرت کی عنایات سے اتنی بات محسوس ہوتی ہے کہ روز بروز دنیوی جھگڑوں سے طبیعت متنفر ہوتی جاتی ہے اور اکثر خلوت میں طبیعت لگتی ہے اور میں بہ یقین جانتا ہوں کہ یہ محض حضرت کی توجہ وہمت کا ثمرہ ہے۔

جواب : یہ توجہ ہے تمام دولتوں کی۔ انشاء اللہ تعالیٰ حرماں نہ ہوگا۔
مکتوب : میرے سارے علم و عمل اور حال و قال کا خلاصہ تو صرف یہ ہے کہ حضرت کی محبت اپنے دل میں پاتا ہوں اور اس پر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں

شب نمودند بمن نامہ اعمال مرا
صبح دیدم کہ بدستم سرگیسوئے تو بود

حضرت کی عنایات سے کیا بعید ہے کہ اس بے حسی سے نجات ملے ' وماذالک علی اللہ بعزیز۔
جواب : اللہ تعالیٰ سے سب امیدیں رکھنا چاہیے۔

پہلا سفر حج

حکیم الامت ؒ سے مشورہ کے بعد آپ نے شوال ۱۳۴۶ھ میں سفر حج کا ارادہ فرمایا۔ یہ زندگی کا پہلا حج تھا، آپ کے بچپن کے دوست اور رفیق درس حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہم (حال[1] مہتمم دارالعلوم دیوبند) کی معیت میں سفر مبارک طے ہوا۔ دیوبند سے روانگی کے وقت مرشد تھانوی ؒ کی خدمت میں مندرجہ ذیل خط لکھا :

دیوبند سے روانگی کے وقت

مکتوب.........شوال ۱۳۴۶ھ

مکتوب : الحمدللہ احقر کا انتظام ہوگیا اور آج پانچ بجے شام کو انشاء اللہ تعالیٰ یہاں سے بمبئی کو روانہ ہونے کا ارادہ ہے' دل چاہتا ہے کہ سب سے آخر میں حضرت کی بارگاہ عالی سے رخصت ہوں لیکن مولوی محمد طیب صاحب روانہ ہوچکے ہیں اور بمبئی میں میرے منتظر ہیں۔ نیز جہاز کی تاریخ روانگی میں مہلت نہیں اس لئے ابھی یہ تمنا پوری نہیں کرسکتا۔
جواب : الخیر فیما وقع۔ تمام مقاصد کے لئے دعا کرتا ہوں۔ اشرف علی

---

[1] موصوف اس وقت مہتمم نہ تھے (رفیع)

مکتوب......۱۸ شوال از بمبئی

مکتوب : کل حضرت کا والا نامہ بمبئی میں وصول ہوا' نہایت مسرت و طمانیت کا باعث ہوا آج بنام خدا جہاز پر سامان بھیجا جاتا ہے' کل بروز بدھ ۱۹ شوال ۴۶ھ انشاء اللہ ۸ بجے صبح کو جہاز بمبئی سے روانہ ہو جائے گا' جہاز کا نام "دارا" ہے مگر ہمارے لئے تو عالم اسباب میں صرف حضرت کی ہمت و دعا کا سہارا ہے یہی ہمارا دارا ہے یہی ہمارا سکندر

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس
ما قصہ سکندر و دارا نخواندہ ایم

اس وقت ہندوستان سے ناکارہ خادم کا یہ آخری عریضہ ہے اگر حق تعالیٰ نے خیریت سے پہنچا دیا تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد مکہ معظمہ سے یہ شرف حاصل کروں گا۔ دعا کی ضرورت تو ہر وقت ہے اور اس وقت بہت زیادہ ہے۔ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ

بدنام کنندہ چند نکونامے احقر محمد شفیع از بمبئی ۱۸ شوال ۴۶ھ

جواب : مشفقم السلام علیکم

بسفر رفتنت مبارکباد
بسلامت روی و باز آئی

انشاء اللہ تعالیٰ دعا سے نہ بھولوں گا اپنے لئے بھی ایک درخواست ہے جو عزیز محترم صاحبزادہ[1] سے آپ کو معلوم ہوگی۔ اشرف علی

دارالعلوم دیوبند میں طلبہ کی ایک جماعت نے منتظمین دارالعلوم کے خلاف اسٹرائک کی' حکیم الامت حضرت تھانوی ؒ نے جو دارالعلوم کے سرپرست تھے اسٹرائک کے خلاف فتویٰ جاری فرمایا' مگر مفسد طلبہ اپنے ساتھ بعض اکابر اساتذہ کرام کو ملوث کرنے میں کامیاب

---

[1] یہ ظاہر حضرت مولانا محمد طیب صاحب مد ظلہم (حال مہتمم دارالعلوم دیوبند) مراد ہیں جن کے ساتھ یہ سفر ہوا تھا (حاشیہ مکاتیب حکیم الامت ص ۲۱)

ہو گئے اس موقع پر حضرت والد صاحبؒ نے مندرجہ ذیل خط لکھا :

اساتذہ کے ساتھ اختلاف رائے کی حدود

مکتوب.........۱۹ رجب ۱۳۴۶ھ

مکتوب : آج اس عریضہ کا داعیہ ایک قلبی اضطراب ہے جو چند روز سے موجودہ فتن اور اپنے اساتذہ و اکابر میں فساد ذات البین کو دیکھ کر روز افزوں ہے ' جانبین کے روزانہ جلسے مساجد میں ہو رہے ہیں بالخصوص "لجنتہ الاتحاد" کے جلسے تو دن میں کئی کئی دفعہ ہوتے ہیں تمام شہر میں شور محشر بپا ہے۔ اہل شہر میں جو لوگ فریقین میں سے کسی سے جماعت تعلق رکھتے ہیں وہ تو ان کی طرف ہیں اور جو لوگ کسی جانب میں نہیں وہ دونوں کو برا کہتے ہیں۔

ادھر میرا نام نہاد علم اور اس کے جو حروف مجھے آتے ہیں وہ زیادہ تر حضرت شاہ صاحب مد ظلہم العالی اور پھر حضرت مفتی صاحب مد ظلہم کا طفیل ہے۔ ہرچند کہ کوئی لفظ کبھی ایسا میری زبان سے نہیں نکلا جو ان حضرات اساتذہ کے لئے باعث گرانی ہو لیکن اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اس جانب کی نفس شرکت بھی فریق ثانی اپنے لئے توہین سمجھتا ہے۔

جواب : اس کا تو علاج ہی نہیں اور نہ ضروری ہے۔

مکتوب : الحمد للہ اس کا تو یقین ہے کہ بزرگوں کے راستے پر وہی جماعت ہے جس کا میں تبع ہوں لیکن ہر وقت یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ لوگ میری طرف سے رنگ آمیزیاں کر کے مختلف باتیں ان حضرات کو پہنچاتے ہیں ' مبادا اس سے ان کو گرانی پیش آ کر علم و عمل کے لئے مضر ثابت ہو۔

جواب : ایسی مضرت ارزاں نہیں ہے ناحق کی کدورت ذرا بھی مضر نہیں اطمینان فرمادیں ' البتہ اپنی طرف سے کوئی بات حدود سے باہر نہ ہونا چاہیے۔

مکتوب : اس لئے ایک گزارش تو یہ ہے کہ موجودہ فتنہ میں میرے لئے کیا طریقہ مناسب ہے ' دوسرے اس دعا کی درخواست ہے کہ حق تعالیٰ ان فتن کے شر سے نجات عطا فرماوے اور اس طرح گزارے کہ کسی استاد کو مجھ سے رنج نہ پہنچے۔

جواب : دل سے دعا ہے۔
مکتوب : تیسرے اگر کوئی ورد بھی فتن سے محفوظ رہنے کے لئے تحریر فرمائیں تو انشاء اللہ تعالیٰ اس پر عمل کروں گا۔
جواب : اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِکَ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ
مکتوب : نیز موجودہ فتنہ روزانہ ترقی پر نظر آرہا ہے، طلبہ بھی اکثر اسٹرائک میں شریک ہوگئے ہیں اور جو باقی ہیں وہ برابر ٹوٹ کر اس طرف جارہے ہیں، سخت پریشانی ہے، امید ہے کہ جناب کے ارشادات باعث طمانیت ہوں گے۔
جواب : مولانا دوسرے کے افعال پر نظر ہی نہ چاہیے۔ "اَلْقَادِرُ بِقُدْرَۃِ الْعَبْدِ لَیْسَ بِقَادِرٍ" اپنے افعال درست کرکے بے فکر ہوجانا چاہیے۔

حکیم الامت[1] کے خلیفہ مجاز اور احقر ناکارہ کے شیخ و مربی، سیدی وسندی عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفی دامت فیوضہم اپنے مخصوص بے ساختہ انداز میں ہم خدام سے بکثرت فرمایا کرتے ہیں کہ "ارے آپ لوگ مفتی صاحب کو نہیں جانتے وہ ہمارے حضرتؒ کے علوم ظاہری، علوم باطنی اور مزاج ومذاق کے پورے پورے وارث تھے، حضرت کے علوم اور مزاج ومذاق کو جتنا مفتی صاحب نے جذب کیا کسی نے نہیں کیا۔ مفتی صاحب کی ہر ادا حکیم الامت مجدد ملت کے مزاج ومذاق میں ڈھلی ہوئی تھی، حضرت عارفی مدظلہم کے اس ارشاد کی ایک جھلک اگلے خط میں نظر آئے گی۔

باطنی حالات میں حضرت مرشدؒ سے بے نظیر مطابقت

مکتوب......۸ رمضان ۱۳۴۸ھ

مکتوب : "یہ ناکارہ بدنام کنندہ چند نکونامے اکثر جب اپنا کوئی حال لکھنے بیٹھتا ہے، تو نفس پر اعتماد نہیں ہوتا کہ جس حال کو میں اس وقت محسوس کررہا ہوں یہ واقعہ میرا حال ہے یا کسی سنی یا دیکھی ہوئی بات کا تخیل؟ اس لئے ڈرتا ہوں کہ خلاف واقع بیان ہوجائے۔"

---

[1] یعنی حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ

جواب : "الحمد للہ بہت مدتوں میں اپنے ایک دوست کی یہ حالت دریافت ہوئی' جو بعینہ میری بھی حالت ہے' خواہ کیسی ہی ہو مگر میرے ساتھ توافق کی تو ضرور دلیل ہے۔ خیر دو تو ایک حالت میں شریک ہوئے۔"

مکتوب : "اور اسی بناء پر اکثر بہت سے وقتی احوال پیش کرنے میں کھٹک رہتی ہے جب تک کہ اس پر کسی حد تک استمرار نہ ہو' اب معلوم نہیں کہ میرا یہ عمل صحیح ہے یا غلط؟"

جواب : "اگر میری یہ حالت نہ ہوتی تو شاید جواب دے سکتا' اب بجز اس کے کیا کہوں کہ اس کو میری سی حالت سمجھ کر صحیح سمجھئے اور میں آپ کی سی حالت سمجھ کر صحیح سمجھوں۔ اگر صحیح بھی نہ ہو اے اللہ! اس کو صحیح کر دیجئے۔"

مکتوب : "آخر شب کے نوافل میں بحمد اللہ اکثر شوق و رغبت اور سکون و طمانیت نصیب ہوتا ہے اور بعض اوقات کیفیت گریہ حالت اضطرار کو پہنچ جاتی تھی لیکن چونکہ یہ حالت مستمر نہ رہتی تھی' اس لئے میں اس کو "نمود" ہی سے تعبیر کرتا تھا' آج دفعتہً خیال ہوا کہ مبادا یہ ناشکری میں داخل ہو' اس لئے اصل حقیقت عرض کر دی' آخر شب میں طول قیام اور طول سجود میں ایک خاص لذت پاتا ہوں اور جس رکن کو شروع کرتا ہوں جب تک تھک نہ جاؤں اس سے منتقل ہونے کو جی نہیں چاہتا۔"

جواب : "مبارک ہو' میرے لئے بھی اس کی دعا کیجئے۔"

مکتوب : "نیز چند روز سے بہ نظر کیمیا اثر یہ بھی دیکھتا ہوں کہ اختلاط سے وحشت اور خلوت میں انس ہوتا ہے' جب چند آدمیوں میں جمع ہو جاتا ہوں تو طبعی تقاضا ہوتا ہے کہ کسی طرح جلد یہ لوگ چلے جائیں یا میں خود چلا جاؤں' حضرت والا کی مجلس میں بھی دل طبعاً اس طرف مائل ہوتا ہے کہ گم صم بیٹھا رہوں مگر لذت خطاب اس پر غالب آجاتی ہے۔ نیز یہ محسوس کرتا ہوں کہ حضرت والا سے جتنا قریب ہوتا ہوں اتنا ہی انوار و برکات قلب میں سکون و طمانیت کے رنگ میں پائے جاتے ہیں' گھر سے زیادہ خانقاہ میں اور پھر خانقاہ کے اور اطراف سے حضرت کے قریب میں بتفاوت درجات متفاوت معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تو وہ الطاف ہیں جو یقیناً اس ناکارہ کے کسی عمل کا ثمرہ نہیں بلکہ حضرت والا کی عنایات کے نتائج ہیں لیکن اپنی عملی حالت دیکھتا ہوں تو لکھتے ہوئے شرم آتی ہے کہ مجھ سے اتنا کام بھی نہیں ہوتا جتنا عام بازاری لوگ کرتے ہیں۔ صبح کو نیند کا غلبہ اس قدر ہوتا ہے کہ صبح کی نماز میں

بھی سستاتا ہوں اور بعد نماز تو بالکل کوئی کام نہیں ہوتا، مجبور ہو کر سو رہتا ہوں اور کئی گھنٹے اس نیند میں ضائع ہو جاتے ہیں، اس لئے جو ورد قرآن مجید کا مقرر ہے اکثر وہ بھی پورا نہیں ہوتا، رات کو پورا کرتا ہوں، اس کے ساتھ جب اس پر نظر پڑتی ہے کہ دیوبند سے سفر کرنا ایک گونہ مجاہدہ و عمل کا ادعاء ہے اور لوگ یہی سمجھتے ہیں تو بے حد افسوس ہوتا ہے کہ میری مثال ایسی ہوگئی کہ "دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔"

جواب : مطمئن رہیے یہ بھی اسی کلی کی ایک جزئی ہے جس کو آپ نے اوپر کی سطروں میں "الطاف ونتائج" سے تعبیر کیا ہے بلکہ اس کے افراد میں سب سے اولیٰ اور اول ہے۔ **اَللّٰھُمَّ زِدْفِیْہِ۔** جس کی حقیقت انکسار و افتقار و اضطرار و فیہ قیل۔

جز خضوع و بندگی و اضطرار
اندریں حضرت ندارد اعتبار

ایسا ہی ایک اور مکتوب

۲۱ رمضان ۱۳۴۸ھ

مکتوب : حال اس ناکارہ کا یہ ہے کہ اگر کہیں کسی وقت خوابِ غفلت اور خمودِ غفلت سے نجات ملتی ہے اور اپنی حقیقت پر نظر پڑتی ہے اور پھر حضرت حق جل وعلیٰ کی عظمت کا تصور ہوتا ہے تو ایک عجیب حیرت کا عالم سامنے آجاتا ہے اور اپنے نفس کو محض مجبور پاتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا سمندر کی موجوں میں ایک تنکا ہے جو۔

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

کا مظہر بنا ہوا ہے اپنا کوئی قول و فعل اپنا نظر نہیں آتا، اس حالت میں اگر قرآن مجید پڑھتا ہوں تو فضائل کی ترغیب اور رذائل کی ترہیب پر یہ سوچتا ہوں کہ یا اللہ! یہ کچھ بھی میرے بس میں نہیں "اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ" اور ایسے وقت اکثر یہ دعا کرتا ہوں۔ "اَللّٰھُمَّ اِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَاصِیْنَا بِیَدِکَ لَمْ تُمَلِّکْنَا مِنْھُمْ شَیْئًا فَاِذَا فَعَلْتَ ھٰذَا فَکُنْ اَنْتَ وَلِیَّنَا" اور "اَللّٰھُمَّ وَاقِیَۃً کَوَاقِیَۃِ الْوَلِیْدِ" زبان پر آتا ہے۔

البتہ یہ عجیب تر ہے کہ عین اس حالت میں بھی جبر محض کا عقیدہ نہیں ہوتا۔ اس انکشاف مجبوریت و مقہوریت کو وجدانی طور پر مسئلہ اختیار کا مزاحم نہیں سمجھتا۔ ایک روز غلبہ عظمت وہیبت میں اپنے کو "بلبل ہوں پر شکستہ فتادہ چمن سے دور" کا مصداق پاتا تھا اور بار بار شعر زبان پر آتا تھا۔

کیف الوصول الی سعاد ودونھا
قلل الجبال و دونھن خیوف

یہاں تک کہ غلبہ یاس ہونے لگا، مگر الحمدللہ رحمت الٰہیہ کی وسعت سامنے آگئی، اور ذہن اس طرف متوجہ ہو گیا کہ اپنی طاقت اور قوت نے نہ اس حد تک پہنچایا ہے اور نہ آگے اس کی رسائی کی توقع ہے جس رحمت نے یہاں دروازہ پر لا ڈالا ہے وہی کسی روز مدد کرے گی تو سب کچھ ہو رہے گا۔

طاعت وتوفیق طاعت ہم زتو
ہم دعاء از تو اجابت ہم زتو

یہ جو لکھا ہے اگرچہ سوچ سوچ کر لکھا ہے کہ شاعرانہ تخیل نہ ہو جائے مگر چونکہ یہ حالت مستمر نہیں، ڈرتا ہوں کہ اس کو اپنا حال کہنا بھی جائز ہے یا نہیں؟ مگر اتنی بات بہ تکرار محسوس کی ہے کہ جب کبھی حضور قلب نصیب ہوتا ہے تو یہی حالت محسوس ہوتی ہے۔

جواب : "الحمدللہ دریا میں خوض عطا ہوا، یہ اس کی موجیں ہیں جو زیر و زبر کر رہی ہیں، اگر اس میں غرق ہو گئے تو یونس علیہ السلام کی سنت نصیب ہوئی اور اگر پار ہو گئے تو موسیٰ علیہ السلام کی سنت نصیب ہو گی، دونوں حالتیں مبارک ہیں، میں تو بہت خوش ہوا اپنے احباب کے لئے ان ہی حالتوں کے معلوم کرنے کا مشتاق رہتا ہوں۔"

ایک مختصر اور جامع نصیحت

ایسا ہی ایک اور مکتوب........۲۸ رمضان ۱۳۴۷ھ

مکتوب : "تہجد کے بارے میں احقر کی عادت یہ تھی کہ کم از کم نصف پارہ اور زیادہ سے زیادہ ایک پارہ آٹھ رکعتوں میں پڑھتا تھا۔ پھر اکثر نشاط نصیب ہوتا تو سجود و رکوع میں بھی دیر لگتی۔ اسی لئے اکثر وقت اسی میں خرچ ہو جاتا تھا اور ذکر کی مقدار اس لئے بہت کم ہوتی تھی۔ پرسوں ترسوں حضرت والا سے یہ سنا کہ مبتدی کے لئے کثرت ذکر زیادہ نافع ہے اور اسی لئے بعض مشائخ نے تہجد میں صرف سورۃ اخلاص پر اکتفا کرنے کا مشورہ دیا ہے' اس وقت سے یہ خیال ہے کہ اس کا پابند ہو جاؤں کیونکہ ذکر اسم ذات جو قصد السبیل میں عام مشغول کے لئے بارہ ہزار مرتبہ تجویز فرمایا گیا ہے' احقر سے ایک دن بھی بارہ ہزار پورا نہیں ہو سکا' کسی دن بہت ہمت کی تو چھ ہزار تک پہنچا جس کی وجہ اکثر قلت وقت اور کبھی ضعف دماغ ہوتی تھی لیکن ضعف کا تدارک تو دو مجلسوں میں کرنے سے ہو سکتا ہے اور قلت وقت کا اختصار فی التہجد سے' مگر چونکہ حضرت نے یہ بات عام بیان فرمائی تھی۔ احقر کے لئے تجویز جزئی نہ تھی' اس لئے استصواب کی ضرورت ہے۔"

جواب : "اس احتمال کا خطور نہایت نافع اور ضروری تھا چنانچہ واقعی وہ عام قاعدہ آپ کی حالت کے مناسب نہیں' آپ تہجد میں اختصار نہ کریں۔ گو ذکر میں اختصار ہو جائے' اکثر ذکر سے جو مقصود ہے وہ بفضلہ تعالیٰ آپ کو تقلیل میں بھی حاصل ہے۔"

مکتوب : آخر میں یہ گذارش ہے کہ یہ ناکارہ و آوارہ بدنام کنندہ نکو ناماں بارگاہ عالی سے رخصت ہونے پر مجبور ہے' مگر حضرت کے الطاف و ہمت و دعا کا ہر وقت محتاج اور طالب ہے

وَاِنِّیْ عَنْکَ یَا مَوْلَایَ غَادٍ
وَقَلْبِیْ عَنْ فِنَائِکَ غَیْرُ غَادِیْ

"دست شیخ از غائبان کوتاہ نیست" جس تفسیر کے ساتھ بھی ہو شکستہ دلوں کا سہارا ہے ایک عرض یہ ہے کہ اگر بلا تکلف و تامل ممکن ہو تو احقر کے لئے کوئی مختصر جامع نصیحت کا جملہ فرمایا جائے جو اس طریق میں احقر کی مدد کرے۔"

جواب : "میرے تجربہ سے جو چیز سب سے زیادہ نافع ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں ایک گھڑی رہنے کا بھی بھروسہ نہیں، وہاں کے لئے تیار رہنا چاہیے۔
وھوالذی امر بہ فی الحدیث "اذا اصبحت فلا تحدث نفسک بالمساء واذا اسیت فلا تحدث نفسک بالصباح وعد نفسک من اصحاب القبور"[1]

اجازت بیعت اور خلافت سے سرفرازی

تھانہ بھون میں چوتھی حاضری ۱۳۴۳ھ یا ۱۳۴۴ھ میں ہوئی تھی اور اب ۱۳۴۹ھ چل رہا تھا، سلوک وتصوف اور عشق ومعرفت کی پرپیچ راہوں سے گذرتے گذرتے اب وہ مقام آگیا تھا جہاں حکیم الامت مجدد ملت حضرت تھانوی جیسا رہبر ورہنما ہر طرح امتحان کرنے کے بعد مطمئن تھا کہ جس مسافر طریقت نے ان کی انگلی پکڑ کر اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اب وہ راستہ کے تمام نشیب وفراز اور پیچ وخم سے نہ صرف پوری طرح باخبر ہے بلکہ ناواقفوں کی رہبری کے لئے بھی اس پر پورا اعتماد کیا جاسکتا ہے۔
ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ میں اچانک حکیم الامتؒ کا مکتوب گرامی دیوبند پہنچا جس میں والد ماجدؒ کو تلقین وبیعت کی اجازت تحریر تھی وہ مکتوب گرامی یہاں بعینہ نقل کیا جاتا ہے۔

حکیم الامتؒ کا گرامی نامہ

ربیع الثانی......۱۳۴۹ھ

"مشفقی مولوی محمد شفیع صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند سلمہ اللہ

---

[1] ترجمہ: اور یہ وہی بات ہے، جس کا حکم حدیث میں دیا گیا ہے کہ "جب تو صبح کرے تو اپنے نفس سے شام کی بات نہ کر اور جب تو شام کرے تو اپنے نفس سے صبح کی بات نہ کر اور اپنے آپ کو اہل قبور میں شمار کر۔ (رفیع)

السلام علیکم : ”بے ساختہ قلب پر وارد ہوا کہ آپ کو مع دوسرے احباب کے بیعت و تلقین کی اجازت ہو، پس توکلا علی اللہ اس وارد پر عمل کرنے کے لئے آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ اگر کوئی طالب حق آپ سے اس کی درخواست کرے تو قبول کرلیں اس سے متعلم کے ساتھ معلم کو بھی نفع ہوتا ہے میں بھی دعا کرتا ہوں اور اپنے خاص محبین پر اس کو ظاہر بھی کر دیجئے۔

بنظر احتیاط بیرنگ لفافہ بھیجتا ہوں۔

والسلام

بندہ اشرف علی از تھانہ بھون ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ

حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو اللہ جل شانہ نے حقیقی تواضع وانکسار سے نوازا تھا' ان کے وہم وخیال میں بھی نہ تھا کہ کبھی یہ نوبت بھی آنے والی ہے کہ حکیم الامت اپنی خلافت سے سرفراز فرمائیں اچانک یہ گرامی نامہ ملا تو حیرت میں رہ گئے اور مرشد تھانوی کو اسی حیرت میں یہ خط لکھا۔

حیرت وفنائیت

مکتوب........۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۹ھ

مکتوب : والا نامہ گرامی صادر ہوا دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ ناکارہ وآوارہ شفیع اور بیعت وتلقین کی اجازت! صلاح کار کجا و من خراب کجا۔

میں تو واللہ کسی بزرگ سے بیعت ہونے کا بھی سلیقہ نہیں رکھتا' سلوک کے ابتدائی

مراحل سے بھی روشناس نہیں، کسی دوسرے کو کیا تلقین کروں گا اور پھر ایسا کون بیوقوف ہو گا جو مجھ سے درخواست بیعت کریگا' بار بار والانامہ کو دیکھتا اور اپنی سیہ کاری پر نظر کرتا ہوں تو حیرت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ مجھ جیسے غفلت شعار سیہ کار کو اتنے بڑے منصب سے نوازنا کہیں اس منصب کی بدنامی کا سبب نہ ہو' اس خیال سے یوں جی چاہتا ہے کہ اس کی اشاعت نہ ہو تو اچھا ہے۔

جواب : "یہی تو بنا ہے اس اجازت کی کہ آپ اپنے کو ایسا سمجھتے ہیں"

مکتوب : "اس والانامہ کے بعد سے ہر قدم پر اپنی ناکارگی کا مزید احساس ہونے لگا"۔

جواب : "انشاء اللہ تعالیٰ بہت نفع ہوگا"

مکتوب : "دعا و ہمت سے دستگیری کی احتیاج بھی اور زیادہ محسوس ہونے لگی"

جواب : "میں حاضر ہوں"

مکتوب : "یہاں تو ہنوز روز اول ہے"

جواب : "نہایت کی تفسیر عود الی البدایہ ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ "روز اول" وہی ہدایت ہے"

اسی سلسلہ کا ایک اور مکتوب

یکم جمادی الثانیہ ۱۳۴۹ھ

مکتوب : "جب سے حضرت والا نے خطاب خاص سے معزز فرمایا ہے میری ست اور کمزور طبیعت کے لئے ایک تازیانہ ہو گیا ہے کسی وقت اس کا تصور ذہن سے نہیں جاتا کہ مجھ جیسا ناکارہ و آوارہ طریق سے ناآشنا اور بزرگوں کی یہ عنایت کہیں مجھی پر حجت نہ ہوں' بالخصوص جب سے دیوبند میں غیر اختیاری طور پر اس کا چرچا ہوا ہے ہر وقت اس سے ڈرتا ہوں کہ لوگ مجھے دیکھ کر میرے بزرگوں کو بدنام کریں گے۔ اس کا الحمد للہ اتنا فائدہ بھی ہوا کہ گناہوں سے بچنے کی کچھ ہمت بڑھ گئی اور نماز میں کچھ من جانب اللہ تعالیٰ حضور کی ایک کیفیت پیدا ہونے لگی جو پہلے نہیں تھی بلکہ پہلے یہ کیفیت گاہ گاہ ہوتی تھی اور اب الحمد للہ اکثر رہنے لگی"

جواب : "مجھ کو یہی امید تھی۔"

مکتوب.........۹ رمضان المبارک ۱۳۵۰ھ

"بارگاہ سامی میں حاضر ہو کر حضرت کی جوتیوں کے طفیل سے الحمدللہ یہ تو ہوا کہ غرور سے ایک گونہ نجات ہوئی اور اپنے کچھ معائب گویا متمثل ہو کر۔

شرمندہ مثل زنگی آئینہ دیدہ ہوں

کی کیفیت پیدا ہو گئی اور یہ اچھی طرح واضح ہو گیا کہ تمام اہل خانقاہ میں سب سے زیادہ ناکارہ و آوارہ بدنام کنندۂ خانقاہ میں ہی ہوں' کئی روز سے حزن کی کیفیت اور حسرت بڑھ رہی ہے کہ جب آفتاب ہدایت کے مواجہہ میں بھی میری تاریکی کا یہ حال ہے تو آئندہ کیا ہوگا۔

جواب : یہ استدلال متکلم فیہ ہے' یہ ایسا استدلال ہے کہ ستارہ کہے کہ جب آفتاب کے سامنے بے نور ہوں تو شب کو کس قدر بے نور ہوں گا۔ بعض اوقات بعض احوال کا ظہور قرب میں نہیں ہوتا بُعد میں ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ان فکروں ہی میں نہ پڑنا چاہیے جو ہو سکے کرتا رہے نہ ہو سکے نادم رہے۔

مکتوب :

شراب لعل وجائے امن و یار مہربان ساقی
ولا کے بہ شود کارت اگر اکنوں نخواہد شد

حضرت کے سب خدام اپنے اپنے کام میں ہیں اور رفیع حالات میں اور اس ناکارہ کا کام صرف یہ ہے کہ کام کرنے والوں کو دیکھتا اور غبطہ کرتا ہے۔ وقت کچھ ایسا تنگ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کام نہیں ہوتا۔ اور ایام عمر گزرتے جاتے ہیں نیند کی کثرت نے اور بھی تباہ کر دیا۔ اب بجز اس کے حضرت والا سے استغاثہ کروں عالم اسباب میں کیا چارہ ہے"

جواب : سب کا جواب معروض ہو چکا ہے۔

مکتوب : ازاں رحمت کہ وقف عام کردی
جہاں را دعوت انعام کردی

نمی دانم چرا محروم ماندم
رہین ایں چنیں مقسوم ماندم

جواب : جب "نمی نادانم" ہے پھر فکر ہی نہیں، مصیبت تو "می دانم" میں ہے۔

مکتوب : امید ہے کہ اس نالائق خادم کی خاص طور سے دستگیری فرمائی جائے گی۔

مستحق کرامت گنہگار انند

جواب : "مطمئن رہنا چاہیے کہ بعض ترقی اطمینان ہی پر موقوف ہے۔"

تھانہ بھون میں قیام کے دوران بھی طالبین اپنے اپنے حالات خط میں لکھتے اور لفافہ میں بند کر کے ایک بکس میں ڈال دیتے تھے جو خانقاہ کی سہ دری میں دیوار پر آویزاں تھا حضرت حکیم الامت روزانہ نماز فجر سے قبل ان خطوط کو نکالتے اور بعد نماز ان کا جواب تحریر فرما کر مسجد کے منبر پر رکھ دیتے تھے، ہر شخص اپنا اپنا لفافہ وہاں سے اٹھا لیتا۔ پچھلا مکتوب والد ماجد نے ۹ رمضان کو بکس میں ڈالا، دس رمضان کی صبح کو جب حکیم الامت خطوط کا جواب لکھ رہے تھے اس وقت والد ماجد کو ایک خاص حالت پیش آئی جو اگلے خط میں مذکور ہے۔

بشارت

مکتوب......۱۰ رمضان ۱۳۵۰ھ

مکتوب : "عریضہ منسلکہ کل احقر نے بکس میں ڈالا تھا اور صبح کی نماز کے وقت جبکہ غالباً حضرت والا نے اس کو ملاحظہ فرمایا۔ تقریباً اسی وقت احقر مسجد میں بیٹھا ہوا "ذکر بارہ تسبیح"

---

[1] مآثر حکیم الامت ص ۵۴ طبع سوم

میں مشغول تھا۔ آخری تسبیح پڑھتے ہوئے بغیر کسی قسم کی نوم کے آنکھیں بند تھیں' ایک عبارت دوہرے حروف میں لکھی ہوئی سامنے آئی جس[1] میں صرف یہ لفظ احقر نے پڑھا اور اسکی ہیئت بھی پوری طرح یاد رہی" کنت" اس کے بعد پھر ایک عبارت سامنے آئی جو پڑھی نہیں گئی۔ اس سے فارغ ہو کر حضرت والا کا جواب منبر پر سے اٹھا کر پڑھا تو" ثلج صدر" ہو گیا اور حضرت نے جو امر اطمینان فرمایا تھا گویا عین اطمینان ہو گیا' اللہ تعالیٰ اس دولت کو تادیر خیر و عافیت کے ساتھ ہمارے لئے قائم و دائم رکھے آمین۔

جواب : آپ کی خوشی سے خوشی ہوئی ادامہا[2] اللہ تعالیٰ لکلنا اور گو اس "کنت" کا سیاق و سباق معلوم نہیں لیکن کنت کا مدلول اکثر وہ حالت ہے جو پہلے تھی۔ اب بدل گئی اور آپ کا حاصل مضمون[3] یہ تھا کہ "تاریکی نہیں گئی" اور میرے جواب کا حاصل یہ ہے کہ "جاتی رہی" "گو ظہور مؤخر ہو' تو ان قرائن سے ظاہراً "کنت" اپنے مدلول مذکور کے اعتبار سے میرے جواب کی تائید ہے کہ "کنت مظلما فیما سبق و لم تبق کذالک[4] الآن" واللہ اعلم

تصانیف کے لئے معلومات کا تبادلہ

حکیم الامت" حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ کے یہاں ایک ایک وقت میں کئی کئی کتابیں زیر تالیف رہتی تھیں' آپ کے خلفاء میں یہ ذوق اور ملکہ بھی سب سے زیادہ والد

---

[1] والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ کو ذکر کے دوران بہ حالت بیداری ایسے واقعات بکثرت پیش آتے تھے' جن کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں "کشف" کہا جاتا ہے اور اپنے بہت سے خطوط میں ان کی اطلاع بھی اپنے مرشد کو دی اور بسا اوقات حکیم الامت" نے ان کی تعبیر بھی بیان فرمائی جیسا کہ اس واقعہ میں ہوا' مگر والد ماجد" دوسروں پر ان کا اظہار نہ فرماتے تھے۔ خود احقر کو بھی ان کی زبانی صرف دو تین ہی واقعات معلوم ہوئے جو کسی خاص ضرورت سے ظاہر فرما دیئے تھے۔ باقی تمام واقعات "مکاتیب حکیم الامت" کے مطالعہ سے علم میں آئے (رفیع)

[2] "یعنی اللہ تعالیٰ اس خوشی کو ہم سب کے لئے دائمی بنا دے۔"

[3] یعنی پچھلے خط میں

[4] یعنی "تم پہلے تاریک تھے اب ایسے نہیں رہے"

ماجد رحمتہ اللہ علیہ ہی کو نصیب ہوا۔ مرشد و مرید ایک دوسرے کی زیر تالیف کتابوں اور ان کے مختلف مراحل سے باخبر رہتے علمی تحقیقات کا باہم تبادلہ بھی جاری رہتا۔ حضرت حکیم الامت کو کوئی مواد ایسا ملتا جو والد صاحب کی زیر تصنیف کتاب میں معاون ہو تو اس کی نشاندہی فرماتے' ادھر والد صاحب کو جو مواد حضرت کی زیر تالیف کتاب کے لئے مناسب نظر آتا یا حضرت طلب فرماتے کتابوں سے نقل کر کے ارسال فرماتے۔ کئی کتابیں تو دونوں حضرات کی مشترکہ تالیف ہیں "مکاتیب حکیم الامت" میں کم خطوط ایسے ہیں جن میں تصانیف یا فتاویٰ کے سلسلے میں مشورہ یا تبادلۂ خیالات نہ ہو' احقر نے ایسے خطوط قصداً یہاں نقل نہیں کئے کیونکہ ان سے دلچسپی صرف اہل علم کو ہو سکتی ہے۔

کتاب "حیلہ ناجزہ" جس میں مظلوم وبیکس عورتوں کی ازدواجی الجھنوں اور مظالم کا فقہی حل تجویز کیا گیا ہے۔ اس کی تالیف درحقیقت حکیم الامت تھانوی، والد ماجد اور حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحب کا مشترک کارنامہ ہے۔ حضرت حکیم الامت کو اس کتاب کی تکمیل کا شدت سے انتظار تھا۔ مسائل نہایت پیچیدہ اور قدم قدم پر مشکلات تھیں۔ اس لئے ملک اور بیرون ملک کے بہت سے علماء وفقہاء سے مشورہ کا سلسلہ کئی سال جاری رہا اور کام پایہ تکمیل تک پہنچنے میں تاخیر در تاخیر ہوتی چلی گئی مندرجہ ذیل معذرت نامہ اسی موقع کا ہے۔

زیر تالیف کتاب "حیلۂ ناجزہ" کے متعلق

مکتوب.........۲۶ محرم

مکتوب : "حضرت میاں صاحب[1] مدظلہم اور مولانا حسین احمد صاحب دونوں سفر میں گئے ہوئے ہیں ان کے واپس آنے پر مولوی عبدالکریم صاحب کی خدمت میں دیوبند[2] آنے کے لئے اطلاع دوں گا۔"

---

[1] والد ماجد کے استاذ محترم حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب (رفیع)

[2] یعنی حیلہ ناجزہ کے بعض مسائل پر سب سے مشورہ کرنے کے لئے (رفیع)

مکتوب : "حیلہ ناجزہ کی تعلیق در تعلیق سے افسردگی سی پیدا ہوتی ہے۔"

جواب : "میں اس سے بہت خوش ہوا' مولوی عبدالکریم صاحب پر بھی یہی اثر ہے مقبولین کی افسردگی کو اللہ تعالیٰ رفع فرماویں گے۔"

درس ابوداؤد بعض تصانیف اور معمولات کے متعلق

مکتوب.......۲۴ ذی قعدہ ۱۳۵۴ھ

مکتوب : "(دارالعلوم میں اسباق کی) جماعتیں ڈیڑھ سو دو سو آدمیوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے آواز پہنچانے میں تکلیف ہوتی ہے بمشکل وقت پورا کرتا ہوں۔"

جواب : "ذمہ دار سے اطلاع ضروری ہے۔"

مکتوب : "حضرت میاں صاحب مدظلہ نے طویل رخصت لے لی ہے اور امسال کام کرنے کا قصد معلوم نہیں ہوتا' ان کی رائے میری مصلحت سے یہ ہے کہ ان کا (درس) ابوداؤد میں پڑھاؤں' میرا بھی دل چاہتا ہے کہ حدیث کا مشغلہ حاصل ہو جائے اس لئے بنام خدا تعالیٰ ان کی کتاب کا بھی سبق شروع کر دیا ہے۔ حضرت بھی دعا فرماویں کہ حق تعالیٰ ظاہری اور باطنی امداد فرماویں۔"

جواب : "دل سے دعا ہے کہ لحن داؤدی و اخلاص داؤدی عطا ہو۔"

مکتوب : "دلائل[1] القرآن کے لئے بھی ایک وقت مقرر کر لیا ہے۔ الحمدللہ تھوڑا تھوڑا روزانہ ہو جاتا ہے۔"

---

[1] "احکام القرآن" عربی کی تصنیف کے سلسلے میں

جواب : اللہ تعالیٰ مدد فرماوے اور تکمیل فرماوے۔

مکتوب : "ایک باب "سجود لغیراللہ" کے متعلق کسی قدر مفصل ہوگیا ہے اس کو ملاحظہ کیلئے علیحدہ بھیجتا ہوں برائے کرم اصلاح فرماکر واپس فرمادیا جائے۔"

جواب : "دیکھا دل خوش ہوا کہیں کہیں پنسل سے نشان بنایا ہے وہاں نظر ثانی کرلیجئے۔"

مکتوب : "اگر حضرت کے نزدیک مناسب و مفید ہو تو اس کو علیحدہ بھی بشکل رسالہ مع ترجمہ شائع کردیا جاوے۔؟"

جواب : واقعی ضرورت ہے۔"

مکتوب : "اس صورت میں کوئی نام بھی تجویز فرمادیا جاوے۔"

جواب : پیشانی پر لکھ دیا ہے (المقالۃ المرضیۃ فی حکم سجدۃ التحیۃ)

مکتوب : "ان کاموں کے مشغلہ اور پھر ضعف کی وجہ سے تہجد اور ذکر تقریباً ڈیڑھ ماہ سے بالکل متروک ہورہا ہے۔ جس کی وجہ سے فکر رہتی ہے کوشش بھی کرتا ہوں مگر پھر ناکام رہتا ہوں۔ حضرت والا کی دعا و توجہ سے حق تعالیٰ ہی امداد فرماویں تو کچھ ہو سکتا ہے۔"

جواب : "اگر حضرتِ محبوب" مسکین محب" کے نقص ہی میں حکمت و مصلحت رکھ دیں تو وہ نقص بھی بحکم کمال ہی ہے۔"

مکتوب : "شروع سال سے احقر نے اپنا طرز عمل یہ کر رکھا ہے کہ نہ کسی مجلس میں جاتا ہوں' نہ کسی سے بلا ضرورت شدیدہ ملتا ہوں' یہاں تک کہ مولوی طیب صاحب اور

مولوی طاہر صاحب کے یہاں کا جانا بھی متروک ہے۔ دوسرے مدرسین وغیرہم سے تو مہینوں مواجہہ کی بھی نوبت نہیں آتی۔ مدرسہ کی مجلس مشاورت کے اجتماع سے بھی تا بمقدور جان بچانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

جواب : "بس امن وعافیت انشاء اللہ تعالیٰ اسی میں ہے۔"

" اگر خواہی سلامت برکنار است"

مکتوب : "اس میں دشمنوں کی سازش اور افتراءات کیلئے تو میدان وسیع ہوتا ہے مگر اپنے قلب میں ایک سکون محسوس ہوتا ہے۔"

جواب : "معیت حق کے ساتھ کوئی چیز مضر نہ ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔"

مکتوب : "اگر حضرت کے نزدیک یہی مناسب ہو تو اس پر قائم رہوں ورنہ جیسا ارشاد ہو اس کی تعمیل کروں۔؟"

جواب : "مناسب کیا' میں تو واجب سمجھتا ہوں۔"

"قطع طریق نہیں قطع مسافت"

(مکتوب اواخر ذی الحجہ ۱۳۵۴ھ)

مکتوب : "ناکارہ غلام کو خدمت اقدس سے واپس آنے کے بعد پھر مرض سابق کی زیادتی اور بے حد ضعف ہو گیا تھا اب الحمدللہ تین چار روز سے عافیت ہے ضعف بھی کم ہے' حضرت کی دعا سے توقع ہے کہ اب مرض وضعف جلد ختم ہو جائیگا لیکن میری عملی حالت ایک مدت سے بہت خراب ہوتی جارہی ہے۔ مولوی کہلاتا ہوں اور خدمت اقدس کی حاضری کی وجہ سے لوگ کچھ اور بھی سمجھتے ہیں لیکن میری عملی حالت ایسی سقیم ہے کہ ہر عامی سے عامی آدمی مجھ سے بہتر ہے' نماز اور جماعت تک ٹھکانے سے ادا نہیں ہوتی۔ اوراد

واشغال اور قیام لیل کا تو پوچھنا کیا۔ تمنا ہوتی ہے کہ کاش حضرت کی طرف احقر کی نسبت مشہور نہ ہوتی اور بالکل عامیانہ حالت میں بسر ہوتی کہ تلبیس کے گناہ سے تو محفوظ رہتا۔"

یہ معلوم ہے کہ یہ سب عملی خرابیاں اختیاری ہیں اور اس لئے جب اس کا دھیان ہوتا ہے تو ہمت بھی کرتا ہوں، کوشش بھی کرتا ہوں مگر نفس وشیطان اس درجہ پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ اکثر کوشش بھی ناکام بلکہ بعض دفعہ الٹی پڑجاتی ہے۔

حضرت کی خدمت کی حاضری اور مکاتیب سے بھی دل شرماتا ہے کہ لوگ اپنے اپنے حالات رفیعہ لے کر حاضر ہوتے ہیں یا بذریعہ مکاتیب پیش کرتے ہیں اور یہ ناکارہ و آوارہ حاضر بھی ہوتا ہے تو بجز دنیوی پریشانیوں کے تذکرہ اور اس کی تدبیر کے سوال کے اور کسی چیز کی توفیق نہیں ہوتی۔ حضرت ؒ کے اوقات عزیز بھی ضائع کرتا ہوں۔ فَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ آج طبیعت زیادہ پریشان ہوئی تو عاجز ہو کر اسکے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا کہ حضرت والا سے دعاء و توجہ کی درخواست کروں۔"

جواب : السلام علیکم۔ طرق الوصول الی اللہ بعدد انفاس الخلائق۔ ان طرق میں ایک طریق بلکہ اقرب طریق یہ ناکارگی بیچارگی پریشانی پشیمانی بھی ہے مگر طبعی اثر کے اعتبار سے "عقرب" ہے۔ مریض کو رائے قائم کرنے کا حق نہیں جس شخص کو طبیب سمجھا جاوے اسکی تشخیص پر اعتماد ضروری ہے۔ بس بالکل بے فکر رہیے۔ قطع مسافت ہو رہی ہے اس کو "قطع طریق" نہ سمجھا جاوے۔ واللہ الہادی

خانگی امور میں خط وکتابت

حکیم الامت سے والد صاحب ؒ کی خط وکتابت درحقیقت بیس سالہ دور کی نہایت مفصل سوانح حیات ہے کیونکہ کوئی شعبہ زندگی ایسا نہیں جس میں قدم قدم پر حکیم الامت سے ہدایات اور دعائیں طلب نہ کی گئی ہوں۔ خاص نجی اور خانگی امور سے متعلق بھی بہت سے خطوط "مکاتیب حکیم الامت" میں درج ہیں، یہاں ایسے چند خطوط کے اقتباسات بھی نقل کئے جاتے ہیں۔

احقر کی ولادت پر

مکتوب ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ

مکتوب : "حضرت کے والا نامے مع یکصد روپے و مسودہ "اماثل الاقوال[1]" وصول ہو کر باعث اطمینان و مسرت ہوئے۔

جواب : اللہ تعالیٰ ہمیشہ مطمئن و مسرور رکھے۔ "اماثل الاقوال" ختم ہوئی اب تک سب تالیفات کے مسودات مدرسہ میں بہت سی مصلحتوں سے محفوظ رہتے ہیں[2] اگر بعد نقل یہ مسودہ بھی بھیج دیا جاوے تو مدرسہ میں داخل کر دیا جاوے۔"

مکتوب : "احقر کا ارادہ تھا کہ جمعہ کی صبح کو دہلی چلا جاؤں تاکہ جمعہ کی تعطیل اس کام میں لگ جائے اور روپیہ کے لئے یہ انتظام کر لیا تھا کہ صرف ایک روز کے وعدہ پر ایک صاحب سے قرض لینے کو کہہ دیا تھا۔ مگر اتفاق یہ ہوا کہ شب جمعہ میں احقر کے گھر میں لڑکا[3] پیدا ہو گیا۔"

جواب : مبارک ہو۔"

مکتوب : حضرت کی دعا سے حق تعالیٰ نے فضل فرمایا، بچہ اور ان کی ماں بحمد اللہ تعالیٰ دونوں خیریت سے ہیں۔"

---

[1] یہ کتاب اس وقت زیر تالیف تھی۔

[2] الحمد للہ اب حضرت حکیم الامتؒ کی تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف کے مسوّدات دار العلوم کراچی (کورنگی) میں محفوظ ہیں۔

[3] اس جگہ حضرت والد صاحبؒ نے حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے کہ "یعنی محمد رفیع سلمہ۔ ۱۲ ش

جواب : "الحمدللہ"

مکتوب : بچہ کے لئے حضرت والا کوئی نام تجویز فرمائیں، اس کے تین بھائیوں کے نام محمد زکی و رضی و ولی ہیں۔"

جواب : یہ سب نام مناسب ہیں حفی، صفی، وفی، نقی، تقی اور آپ کے نام کے مناسب محمد رفیع، عبدالسمیع، محمد رفیع کا ایک سجع بے ساختہ ذہن میں آگیا۔

" زجملہ خلائق محمد رفیع "

احقر کے بھائی جان جناب مولانا محمد زکی صاحب کیفی مرحوم[1] جو ہم بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اور بچپن ہی میں حضرت سے بیعت ہوگئے تھے۔ ان پر حضرت حکیم الامت کی خصوصی توجہ تھی بہت سے خطوط میں ان کا ذکر ہے۔ ایک خط اس سلسلے میں ملاحظہ ہو۔

بھائی جان کے متعلق

حکیم الامتؒ کا گرامی نامہ بنام والد صاحبؒ ۱۰ رمضان ۱۳۶۰ھ

"از اشرف علی، السلام علیکم، میں نے جو منی آرڈر اہلیہ شاہ صاحب مرحوم کو دینے کے لئے ایک پچاس روپے کا، دوسرا سو روپے کا جو وضع فیس کے بعد ۸۔ اور عہ (یعنی آٹھ آنے اور ایک روپیہ) کم ہوگیا بھیجے ہیں آپ کے نام پر، فارم رسید کا زکی[2] کے دستخط سے آیا اور دوسرے کی رسید اب تک نہیں آئی، یہ دونوں موجب تردد ہیں بوجہ آپ کے دستخط نہ ہونے کے۔ پھر حکیم شریف[3] صاحب آپ کا خط دستی لائے، اس میں بھی کوئی اطلاع نہ تھی، جس سے تردد بڑھ گیا۔ اس لئے یہ خط بھیج رہا ہوں کہ ان کے وصول اور مستحق کے پاس ایصال سے بہت جلد رفع تردد کیا جاوے، باقی خیریت، الحمدللہ میری صحت بڑھ رہی ہے۔

---

[1] ۱۰، ۱۱ محرم ۱۳۹۵ھ کی درمیانی شب میں بعمر پچاس سال لاہور میں انتقال ہوا۔ رحمۃ اللہ علیہ

[2] اس وقت بھائی جان کی عمر سولہ سال تھی (رفیع)

[3] احقر کے سب سے بڑے بہنوئی حکیم سید شریف حسین حسنی صاحب مدظلہ مراد ہیں (رفیع)

والد صاحبؒ کا جواب اور بھائی جان کی حالت پر اظہار مسرت

مکتوب.....۱۱ رمضان ۱۳۶۰ھ

"بعد سلام مسنون نیاز مشحون عرض ہے کہ کل حضرت والا کا مرسلہ منی آرڈر ننانوے روپے کا اور آج ایک کارڈ وصول ہوا۔ اس سے پہلے لعہ للعہ ۴۹ (انچاس روپے آٹھ آنے) بھی وصول ہو چکے جس کے فارم کو محمد زکی نے اپنے دستخط سے وصول کیا تھا، جس کی رسید بھی اگلے روز لفافہ میں روانہ کردی تھی۔"

وہ لفافہ ڈاک میں ضائع ہو گیا تھا، آگے اس رسید اور لفافہ کی تفصیلات درج کی ہیں اس کے بعد لکھا ہے کہ :

"میاں زکی سلمہ پر بحمد اللہ کافی اطمینان ہونے کی وجہ سے میں نے چٹھی رساں (ڈاکیہ) سے یہ کہہ رکھا ہے کہ میں کسی وقت گھر میں نہ ملوں تو زکی سلمہ کو دے دے اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ محمد زکی سلمہ سلام عرض کرتا ہے۔"

جواب: "السلام علیکم۔ اطمینان ہو گیا، جزاکم اللہ تعالیٰ۔ محمد زکی کی حالت معلوم کرکے بہت مسرت ہوئی۔ دوسرا پرچہ شاہ صاحبؒ کے گھر میں دے دیا جائے۔"

مرید و مرشد کے درمیان خط و کتابت کا یہ سلسلہ اتنا سبق آموز، دلچسپ اور علمی و تاریخی معلومات سے پر ہے کہ کسی خط کو چھوڑنے پر دل آمادہ نہیں ہوتا، اس لئے انتخاب میں بڑی دشواری پیش آئی۔ احقر نے اس انتخاب میں کوشش کی ہے کہ ہر دور اور ہر قسم کی خط وکتابت کی جھلکیاں صرف ایک ایک دو دو خطوط کی صورت میں پیش کردی جائیں۔ کہیں کہیں اختصار کے لئے صرف اقتباسات لئے ہیں اس کے باوجود یہ بیان خاصا طویل ہو گیا۔

خانقاہ تھانہ بھون میں آپ کی خصوصیت

حضرت تھانویؒ کو اللہ جل شانہ، نے حکیم الامت بنایا تھا۔ آپ اپنے مریدین اور خلفاء کی استعداد کا جائزہ لے کر ہر ایک کو اس کے مناسب ریاضت یا دوسرے دینی امور تفویض فرمایا کرتے تھے، والد ماجد مد ظلہم نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہ علم و تقویٰ کا

بے نظیر ماحول تھا' جس کا اثر آپ کی زندگی کے ہر پہلو پر بچپن ہی سے نمایاں تھا' طبیعت سلیم پائی تھی' اس لئے حکیم وقت حضرت تھانویؒ نے آپ کو اوراد و وظائف اور ریاضت و مجاہدہ میں زیادہ لگانے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی' بلکہ آپ کی دینی فراست' ٹھوس علمی استعداد اور منجھے ہوئے علمی ذوق کے پیش نظر آپ کو اکثر و بیشتر تصنیف و تالیف' علمی تحقیقات اور فتویٰ وغیرہ کا کام سپرد فرمایا۔ اسی لئے خود حضرتؒ کی تصانیف' فتاویٰ اور دوسری علمی تحقیقات میں ہاتھ بٹانے کا آپ کو خوب موقع ملا' حضرت تھانویؒ ہر مشورہ طلب تحقیقی کام میں آپ سے مشورہ لیتے' کبھی تھانہ بھون بلا کر' کبھی خط و کتابت کے ذریعہ۔ اس دور کی تقریباً تمام علمی تحقیقات میں آپ اپنے مرشد کے ساتھ شریک رہے۔ بارہا ایسا ہوتا کہ حضرت تھانویؒ کو کسی تصنیف کی ضرورت محسوس ہوتی اور مشاغل یا ضعف کے باعث اس کا موقع نہ ہوتا تو یہ کام حضرت والد ماجد کے سپرد کر دیا جاتا، آپ کی متعدد وقیع تصانیف اسی طرح وجود میں آئیں' مثلاً حیلہ ناجزہ اور احکام القرآن عربی ان دونوں تصانیف کا ذکر آخر میں قدرے تفصیل سے آئے گا۔

حضرت تھانویؒ کے تمام ہی خلفاء علم و عمل' اور دیانت و تقویٰ اور اصلاح و ارشاد کے درخشاں مینار ہیں' لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اپنے پیرو مرشد کے علمی مزاج کو سب سے زیادہ حضرت مفتی صاحب نے اپنایا تھا۔ حضرتؒ کو فتاویٰ کے بارے میں سب سے زیادہ اعتماد حضرت مفتی صاحبؒ کی تحقیقات پر ہوتا تھا۔ بارہا کسی علمی تحقیق پر اپنے کئی خلفاء کو مامور فرمایا کہ ہر ایک اپنی اپنی تحریر پیش کرے۔ حضرت مفتی صاحبؒ بھی ان میں شامل ہوئے اور اکثر و بیشتر آپ ہی کی تحریر کو پیرو مرشد نے سب سے زیادہ پسند فرما کر دعائیں دیں۔

اب ہم حضرت والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ کی سوانح حیات کے دوسرے پہلوؤں کا تذکرہ کریں گے۔ لیکن درحقیقت وہ سب پہلو بھی خانقاہ تھانہ بھون سے تعلق ہی کی تفسیر ہوں گے کیونکہ والد ماجد قدس سرہ کی زندگی کا ہر گوشہ حضرت حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے مربوط' انہی کی ہدایات سے مزیّن' انہی کے مزاج و مذاق کے سانچے میں ڈھلا ہوا اور انہی کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً

تدریسی کارنامے

دارالعلوم دیوبند میں

حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے تدریس کا سلسلہ دارالعلوم دیوبند میں ابتدائی کتابوں سے شروع فرمایا۔ پھر سالہاسال اوپر کے سب درجات میں تمام علوم وفنون اپنے باکمال اساتذہ کے زیر سایہ پڑھائے۔ حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ :

"دارالعلوم کی طرف سے تو صرف چھ گھنٹے کی پابندی تھی مگر میں روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا تھا۔"

درس حدیث

بالآخر بزرگوں کی خواہش و ایماء پر آپ کو درجہ علیا (دورہ حدیث) کے اساتذہ میں شامل کرلیا گیا۔ جس کا واقعہ[1] یہ ہوا کہ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمتہ اللہ علیہ جب سلہٹ میں تشریف فرما تھے وہاں حدیث پڑھانے کے لئے ایک مدرس کی ضرورت پیش آئی جس کے لئے حضرت مدنی رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کو بذریعہ خط دعوت دی' آپ نے عذر کیا کہ "اس وقت تک دارالعلوم میں مجھے کبھی حدیث پڑھانے کا اتفاق نہیں ہوا' میرا مشغلہ زیادہ تر ادب اور دوسرے فنون رہے۔" اس پر تقاضے کا خط آیا کہ ایسا کیوں کیا؟ حدیث کی تعلیم کو ضروری سمجھو' پھر دیوبند تشریف آوری کے وقت دوبارہ تقاضا فرمایا' آپ نے عرض کیا "جہاں استاذ محترم حضرت شاہ صاحب درس حدیث دیتے ہوں وہاں ایسا احمق کون ہوگا جو مجھ سے حدیث پڑھنے کو گوارا کرلے۔" فرمایا کوئی نہ کوئی کتاب حدیث کی ضرور پڑھایا کرو۔" بار بار تقاضا فرمایا۔ بالآخر دارالعلوم کی طرف سے سب سے پہلے مؤطا امام مالکؒ کا درس آپ کے سپرد ہوا اس کے بعد دورہ حدیث کی دوسری کئی کتابیں پڑھانے کی نوبت آئی۔

درس ابوداؤد

"سنن ابو داؤد آپ کے استاذ مہربان' ولی زاہد حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین

---

[1] نقوش و تاثرات (سفرنامہ تھانہ بھون و دیوبند) ص ۳۲' ۳۳

صاحب رحمتہ اللہ علیہ پڑھاتے تھے۔ ۱۳۵۴ھ میں انہیں دوران سال سفر پیش آیا تو ابوداؤد کا درس آپ کے سپرد فرما کر تشریف لے گئے۔ پھر استاذ موصوف کی خواہش پر مستقل طور سے یہ درس آپ ہی کی طرف منتقل ہو گیا اور سالہا سال جاری رہا۔

یوں تو ہر علم و فن میں آپ کا درس بہت مقبول رہا۔ علوم عقلیہ منطق، فلسفہ وغیرہ کی انتہائی کتابوں میں آپ کا درس بہت ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آپ کے دو درس خصوصیت سے بہت مشہور ہوئے۔ ایک دورہ حدیث کی مشہور کتاب سنن ابوداؤد شریف کا اور دوسرا عربی ادب کی مشہور کتاب مقامات حریری کا۔ ان کتابوں کے درس میں شرکت کو مختلف ممالک کے نہ صرف طلبہ بلکہ علماء کرام بھی اپنی سعادت شمار کرتے تھے۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں

۲۶ سالہ خدمات کے بعد دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہو کر بھی آپ نے درس حدیث کا سلسلہ بالکلیہ ترک نہیں فرمایا۔ آپ کے استاذ محترم شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ جو دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہونے کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت میں درس بخاری دیتے تھے، سخت علیل ہو کر دیوبند تشریف لے آئے تو غالباً تعلیمی سال کے اختتام میں تین ماہ باقی تھے۔ اس وقت جامعہ کے مہتمم صاحب ان کی جگہ آپ کو لینے کے لئے دیوبند تشریف لائے۔ ان کے اصرار اور شیخ الاسلام کے ارشاد پر آپ نے تین ماہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بخاری شریف کا درس دیا۔

پاکستان تشریف لائے تو کراچی میں کوئی دینی مدرسہ ایسا نہ تھا جہاں یہ سلسلہ جاری کیا جاسکتا۔ مگر کچھ منتہی طلبہ یہاں بھی آگئے۔ ان کو آپ نے اور حضرت مولانا شاہ بدر عالم صاحب مہاجر مدنی رحمتہ اللہ علیہ نے جامع مسجد جیکب لائن میں بعض اسباق پڑھائے۔ ان طلبہ میں حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا آفتاب عالم صاحب بھی شامل تھے۔

دارالعلوم کراچی میں

پھر شوال ۱۳۷۰ھ میں آپ نے دارالعلوم کراچی کی تاسیس فرمائی تو اس میں بھی کئی

سال بخاری شریف کے درس سے طلبہ کو مشرف فرمایا۔ جب قویٰ میں انحطاط اور ملّی مصروفیات میں اضافہ ہوا تو کئی سال بخاری شریف کا درس اس طرح جاری رکھا کہ بخاری کتاب الوضوءٗ تک آپ پڑھاتے اور باقی کتاب دارالعلوم کے دوسرے اساتذہ پڑھاتے تھے' زندگی کے آخری چار سال جن میں آپ صاحب فراش رہے' ان میں یہ سلسلہ تو جاری نہ رہ سکا مگر طلبہ واساتذہ دارالعلوم کے اصرار پر ہر سال بخاری شریف کا پہلا اور صحاح ستہ کا آخری درس آپ ہی دیا کرتے تھے۔ دارالعلوم کراچی میں بخاری شریف کے علاوہ مؤطا امام مالک اور شمائل ترمذی کا درس بھی کئی سال جاری رہا۔ خوش قسمتی سے ناچیز راقم الحروف کو اور برادر عزیز مولانا محمد تقی سلمہ کو بھی حضرت والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ سے کئی کتابیں پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی' احقر نے بچپن میں قاعدہ بغدادی بھی حضرت والد ماجدؒ سے پڑھا تھا اس وقت آپ دارالعلوم دیوبند میں صدر مفتی اور استاذ حدیث تھے۔ مجھے اپنے ساتھ دارالافتاء لے جاتے اور وہیں قاعدہ بغدادی پڑھایا کرتے تھے۔ روزانہ سبق کے بعد پیسے دیتے اور جب دیکھتے کہ میرا دل پڑھنے میں نہیں لگ رہا یا ذہن بوجھل ہونے لگا ہے تو کھیلنے کے لئے چھوڑ دیتے۔ میں وہیں مولسری کے نیچے کھیل کود کر تازہ دم ہو کر واپس آتا تو سبق پڑھاتے' کبھی یاد نہیں کہ میرے ذہن پر بوجھ ڈالا ہو' پورا قاعدہ کھیل کھیل میں پڑھا دیا تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد رات کو مجھے اور برادر بزرگوار جناب محمد ولی رازی صاحب کو انبیاء کرام علیہم السلام اور بزرگان دین کے واقعات نہایت دلنشین انداز میں سنایا کرتے تھے۔ جو بحمد اللہ لوح قلب پر آج تک کندہ ہیں۔ یہ واقعات بعد میں بارہا کتابوں میں پڑھنے پڑھانے کی نوبت آئی مگر اب بھی جب ان کی تفصیلات یاد آتی ہیں تو کتابوں کے بجائے آپ ہی کی سنائی ہوئی تفصیلات ایسی سامنے آجاتی ہیں گویا اب سنا رہے ہوں' اس کے بعد آپ نے ایک چہل حدیث جو آپ ہی کی تالیف تھی' اس کی پوری چالیس حدیثیں مع ترجمہ احقر کو یاد کرا دی تھیں جب دارالعلوم کراچی میں ناچیز کا اور برادر عزیز مولانا محمد تقی صاحب عثمانی کا دورہ حدیث شروع ہوا تو دیگر طلبہ کے ساتھ ہم دونوں بھائیوں کو بھی آپ سے مؤطا امام مالکؒ اور شمائل ترمذی پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ دورہ حدیث سے فراغت کے بعد آپ نے ہمیں شرح عقود رسم المفتی اور مقدمہ در مختار مع حاشیہ شامی اور الاشباہ والنظائر بھی جو فتویٰ کی بنیادی کتابیں

ہیں خصوصی اہتمام سے پڑھائیں اور کئی سال فتویٰ نویسی کی مشق بھی آپ ہی نے کرائی۔
فللہ الحمد اولاً و آخراً۔

آپ کے درس کی خصوصیات

ناچیز راقم الحروف میں یہ اہلیت تو نہیں کہ حضرت والد ماجدؒ کے درس مبارک کی خصوصیات احاطہ تحریر میں لا سکے ۔ تاہم جس حد تک فہم ناقص کی رسائی ہوئی عرض کرتا ہوں۔

(۱) آپ کے درس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ سبق کے دوران طالب علم کے ذہن کو کبھی بوجھل نہ ہونے دیتے تھے، مشکل سے مشکل بحث ایسی سادگی اور سہولت سے مختصر وقت میں ذہن نشین کرادیتے کہ طلبہ کو اس کے مشکل ہونے کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ بسا اوقات پورا درس دوران درس ہی خوب یاد ہو جاتا تھا۔

(۲) غیر ضروری اور غیر متعلق مباحث اور نکات کے بیان سے اجتناب فرماتے۔ حل کتاب پر پوری توجہ دیتے اور اصل توجہ مضامین مقصودہ کی طرف رہتی، طلبہ کو بھی اسی طرف متوجہ رکھتے۔

(۳) کوئی ضروری بحث یا مسئلہ مناسب تفصیل کے ساتھ ذہن نشین کرائے بغیر آگے نہ بڑھتے تھے۔

(۴) آپ کے درس سے طلبہ کو صرف کتاب یا حواشی سے نہیں بلکہ فن سے مناسبت پیدا ہو جاتی تھی۔

(۵) درس کی رفتار ہمیشہ معتدل ہوتی اور کتاب کے اول سے آخر تک یکساں رہتی تھی۔

(۶) آپ کا درس رسمی مباحث کا پابند نہ تھا بلکہ جس زمانے میں جن مباحث کی زیادہ ضرورت محسوس فرماتے ان پر زیادہ زور دیتے تھے۔

(۷) جن مسائل کا تعلق زندگی کے جیتے جاگتے مسائل سے ہوتا یا جن سے عصر حاضر کی مشکلات کے حل میں مدد ملنے کی امید ہوتی ان کو آپ خصوصیت سے زیر بحث لاتے۔

(۸) طلبہ کو درس کے مباحث اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں متحرک، زندہ اور رچے بسے

نظر آتے' وہ زندگی سے اپنی درسیات کا ربط نمایاں طور پر محسوس کرتے اور درس کی اہمیت گہرائی اور وسعت کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے جو ان پر مطالعہ کے ذوق شوق اور محنت وکامیابی کے دروازے کھول دیتا تھا۔

(۹) آپ کے درس کا خاص اثر یہ تھا کہ طلبہ کے دلوں میں انبیاء کرام علیہم السلام' صحابہ کرام' ائمہ مجتہدین اور بزرگان سلف کی عقیدت ومحبت جاگزیں ہو جاتی تھی۔

(۱۰) دوران درس جن کتابوں کے حوالے آتے بسا اوقات ان کا اور ان کے مصنفین کا مختصر تعارف بھی کرا دیتے تاکہ طلبہ میں ان کے مطالعہ کی بھی رغبت پیدا ہو۔

(۱۱) کوئی طالب علم سوال کرتا تو اس کا سوال پوری توجہ سے سنتے اور اس کی ہمت افزائی فرماتے' کوئی معقول اعتراض کرتا تو اپنی بات کی پچ کبھی نہ بھرتے' اعتراض کو قبول فرما لیتے' کسی سوال کا جواب فوراً مستحضر نہ ہوتا تو فرماتے کہ تحقیق کر کے اس کا جواب دوں گا۔

(۱۲) درس حدیث میں تفقہ کا رنگ غالب رہتا تھا۔

آپ کے تلامذہ

آپ کے براہ راست شاگردوں کی تعداد یقین سے نہیں کہا جاسکتا کتنے ہزار ہوگی۔ برصغیر ہندو پاک کے تمام صوبوں اور ریاستوں کے علاوہ چین' انڈونیشیا' ملایا' برما' سیلون' افغانستان' ایران' ترکستان' بخارا' سمرقند اور افریقہ وغیرہ کے بھی ہزارہا طلبہ نے آپ سے شرف تلمذ حاصل کیا ہے جن میں محدثین و مفسرین بھی ہیں' فقہاء و متکلمین بھی' صوفیاء کرام بھی ہیں' مبلغین و واعظین بھی' قاضی اور مفتیان کرام بھی ہیں اور دینی اداروں کے بانی و منتظمین بھی' سیاسی زعماء بھی ہیں اور مدرسین و مصنفین بھی۔ غرض دین کے ہر شعبہ میں آپ سے استفادہ کرنے والے جلیل القدر علماء دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں جہاں ان کی دینی خدمات مختلف شعبوں میں جاری ہیں۔ اب آپ کے براہ راست شاگرد تو ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں لیکن شاگردوں کے شاگرد اور ان کے شاگردوں کی تعداد روزافزوں ہے جو انشاءاللہ تعالیٰ بڑھتی ہی جائے گی۔

آپ کے مشہور تلامذہ کا مختصر مگر جامع تعارف حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے منظور نظر نواسے برخوردار عزیز مولوی رشید اشرف سلمہ' مدرس دارالعلوم کراچی نے اپنے ایک

تحقیقی مقالہ میں کرایا ہے جو ماہنامہ البلاغ کے "مفتی اعظم نمبر" میں شائع ہو رہا ہے۔ یہاں آپ کے مشہور تلامذہ میں سے چند حضرات کے صرف اسماء گرامی لکھے جاتے ہیں۔

مشہور تلامذہ کے اسماء گرامی

۱۔ شیخ الحدیث علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمتہ اللہ علیہ، بانی جامعتہ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی و سابق امیر مجلس تحفظ ختم نبوت و رکن اسلامی نظریاتی کونسل وصدر وفاق المدراس العربیہ پاکستان۔

۲۔ حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب مد ظلہم خلیفہ مجاز حضرت تھانویؒ و سربراہ مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد، ضلع مظفر نگر (بھارت)

۳۔ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ سابق ناظم اعلیٰ جمعیتہ علماء ہند۔

۴۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق صاحب مد ظلہم بانی و مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پشاور) وسابق رکن قومی اسمبلی پاکستان۔

۵۔ عالم محقق حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب صفدر، شیخ الحدیث نصرۃ العلوم گوجرانوالہ (پنجاب)

۶۔ خطیب پاکستان حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی مد ظلہم، بانی و مہتمم دار العلوم الاسلامیہ، ٹنڈو اللہ یار، سابق قائد مرکزی جمعیت علماء اسلام وسابق رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان۔

۷۔ شیخ القراء حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب پانی پتی، دام ظلہ، صدر شعبہ حفظ، و تجوید۔ دار العلوم کراچی، مقیم حال مکہ مکرمہ۔

۸۔ مولانا محمد انوار الحسن صاحب انور، شیر کوٹی، سابق صدر شعبہ فارسی، اسلامیہ کالج فیصل آباد (پنجاب)

۹۔ حضرت مولانا سید حسن صاحب دیوبندی رحمتہ اللہ علیہ، مجاز صحبت حضرت حکیم الامت تھانویؒ و سابق استاذ حدیث و تفسیر دار العلوم دیوبند۔

۱۰۔ حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی، بانی و مہتمم اشرف المدارس ناظم آباد

کراچی۔

۱۱۔ حضرت مولانا مفتی سیاح الدین صاحب مدظلہم رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

۱۲۔ حضرت مولانا سید بادشاہ گل صاحب مدظلہم مہتمم جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک۔ پشاور

۱۳۔ حضرت مولانا سید نور الحسن بخاری مدظلہم فاضل دیوبند و سرپرست تنظیم اہلسنّت پاکستان

۱۴۔ حضرت مولانا عرض محمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ بانی مدرسہ مطلع العلوم بروری روڈ کوئٹہ بلوچستان۔

۱۵۔ حضرت مولانا قاری رعایت اللہ صاحب مدظلہم ۔استاذ حدیث و سابق ناظم اعلیٰ دارالعلوم کراچی۔

۱۶۔ حضرت مولانا سبحان محمود صاحب مدظلہم استاذ حدیث و تفسیر و ناظم دارالعلوم کراچی۔

۱۷۔ حضرت مولانا غلام محمد صاحب دامت برکاتہم۔ استاد حدیث و تفسیر دارالعلوم کراچی۔

۱۸۔ برادر عزیز مولانا محمد تقی صاحب عثمانی ۔استاذ حدیث و مدیر ماہنامہ البلاغ و نائب مہتمم دارالعلوم کراچی و رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان۔

۱۹۔ حضرت مولانا قاضی عبدالکریم صاحب صدر مدرس نجم المدارس کلاچی ڈیرہ اسماعیل خاں۔

۲۰۔ حضرت مولانا قاری عبدالعزیز شوقی صاحب انبالوی سابق صدر مدرس دارالعلوم الاسلامیہ لاہور۔

۲۱۔ حضرت مولانا مفتی عبدالحکیم صاحب مفتی و استاذ حدیث مدرسہ اشرفیہ سکھر و رکن مجلس منتظمہ دارالعلوم کراچی و خلیفہ مجاز حضرت مفتی اعظم رحمتہ اللہ علیہ۔

۲۲۔ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب ،صدر نظام اسلام پارٹی و شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ پٹیہ چاٹگام بنگلہ دیش۔

۲۳۔ حضرت مولانا مصلح الدین صاحب کشور گنج ضلع میمن سنگھ بنگلہ دیش۔

۲۴۔ حضرت مولانا مفتی محی الدین صاحب خلیفہ مجاز حضرت مفتی اعظم و مفتی و استاد حدیث مدرسہ اشرف العلوم بڑا کٹرہ ڈھاکہ۔

۲۵۔ مولانا عبدالقدوس صاحب صدر شعبہ عربی۔ پشاور یونیورسٹی۔

۲۶۔ قاضی زین العابدین صاحب میرٹھی (مؤلف بیان اللسان)

۲۷۔ حضرت مولانا امیرالزماں کشمیری صاحب مہتمم مدرسہ عربیہ قاسم العلوم نعمان پورہ باغ پونچھ آزاد کشمیر۔

۲۸۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم پلندری آزاد کشمیر۔

۲۹۔ مولانا عبدالصمد صارم صاحب (کئی مفید کتابوں کے مصنف ہیں)۔

۳۰۔ مولانا محمد آفتاب عالم صاحب مہاجر مدنی۔ فرزند رشید حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمتہ اللہ علیہ۔

فتویٰ کی ذمہ داریاں

افتاء کا منصب علمی سلسلوں میں سب سے زیادہ اہم مشکل اور نازک ترین سمجھا گیا ہے' فقہ کے لاکھوں ملتے جلتے مسائل کا تھوڑے تھوڑے فرق سے حکم بدل جاتا ہے۔ بہت سے احکام زمانہ اور حالات کے تغیر سے بھی بدلتے ہیں جنھیں محسوس کرنا معاملہ فہمی' عمیق علم اور وسعت معلومات کو چاہتا ہے 'مفتی میں جب تک فقہ سے کامل مناسبت' ذہن وذکاء میں خاص قسم کی صلاحیت 'ایک گونہ قوت اجتہاد' حالات زمانہ پر کماحقہ نظر' کامل درجہ کی احتیاط کے ساتھ وسعت نظر' صلاح و تقویٰ 'بردباری اور تواضع کی شانیں نہ ہوں اس منصب کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

جب حضرت والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند میں تدریس کا آغاز فرمایا' اسوقت دارالعلوم کے صدر مفتی حضرت مولانا عزیزالرحمٰن صاحب عثمانی تھے جو مذکورہ بالا صفات کے جامع ہی نہیں بلکہ مفتیان ہند کے استاد ومربی سمجھے جاتے تھے 'حضرت والدماجد نے ان سے مشکوۃ 'جلالین اور مؤطا وغیرہ پڑھی تھیں۔ آپ پر خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں آئے ہوئے سوالات گاہے گاہے والد صاحب کو عنایت فرمادیتے آپ جواب لکھ کر پیش کرتے جو اصلاح وتصدیق کے بعد دارالافتاء سے جاری کردیے جاتے مگر والد ماجد کے تدریسی مشاغل کے سبب یہ سلسلہ کچھ زیادہ نہ رہ سکا اور ۱۳۵۰ھ تک تقریباً پندرہ سال آپ کے فرائض منصبی تدریس ہی تک محدود رہے۔

دارالعلوم دیوبند میں منصب افتاء کی پیشکش

۱۳۴۴ھ میں مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ دارالعلوم سے مستعفی ہوگئے تو اس منصب کیلئے موزوں شخصیت کے انتخاب کا مشکل مرحلہ ذمہ داران دارالعلوم کے سامنے آیا۔ ضرورت ایسی جامع شخصیت کی تھی جو اس خلا کو دارالعلوم دیوبند کے اعلیٰ تحقیقی معیار کے مطابق پر کرسکے۔ چند سال تک دارالافتاء کا کام مختلف صورتوں سے جاری رہا۔ بالآخر اساتذہ بزرگوں اور ذمہ داران دارالعلوم کی نگاہ انتخاب حضرت والد ماجدؒ پر آکر رکی۔

اس وقت آپ کی عمر ۳۵ سال تھی۔ ہر علم وفن کے اسباق متواتر پندرہ سال پڑھا چکے تھے، علمی تبحّر سب کے نزدیک مسلّم مگر تواضع کی یہ شان اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی کہ خود کو کسی طرح بھی اس منصب کا اہل نہ سمجھتے تھے۔ دارالعلوم کی طرف سے پیش کش ہوئی تو قبول کرنے میں آپکو بہت پس و پیش ہوا۔

حکیم الامتؒ سے مشورہ

بالآخر حکیم الامتؒ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ جو والد ماجدؒ کے مرشد و مربی تو تھے ہی اس وقت دارالعلوم دیوبند کے بھی باضابطہ سرپرست تھے ان کی خدمت میں مشورہ کے لئے یہ خط لکھا۔

مکتوب.........۲۱ محرم ۱۳۵۰ھ

ایک ضروری عرض اس وقت یہ ہے کہ مدرسہ (دارالعلوم دیوبند) میں موجودہ مفتی صاحب کے متعلق ارباب حل و عقد کو عام شکایت ہے اس لئے وہ تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے بھی اس سلسلے میں ایک مرتبہ میرا نام لیا گیا تھا مگر نامکمل بات ہوکر رہ گئی تھی۔ اس مرتبہ پھر یہ سلسلہ اٹھا ہے اور یہاں اکثر حضرات مجھے اس کام کے لئے مقرر کرنا چاہتے ہیں۔

کام فی نفسہ سخت ہے اور پھر مجھ جیسے ناکارہ و نااہل کے لئے جس کو اس کام کی اب

تک کچھ زیادہ نوبت بھی نہیں آئی۔ گویہ تجویز ہوا ہے کہ مولانا سید اصغر حسین صاحب یا مولانا اعزاز علی صاحب کے ملاحظہ کے بعد فتاویٰ روانہ کیے جائیں گے۔ تاہم ابتدائی کام تو مجھے ہی کرنا پڑے گا۔

البتہ یہ نفع بھی اس میں معلوم ہوتا ہے کہ اگر کام قابو میں آگیا تو دینی نفع بھی بڑا ہے اور درس و تدریس میں جو دماغی تکلیف میری وسعت سے زائد ہو رہی تھی[1] اس میں تخفیف ہو جائے گی۔ ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اس کا حل حضرت ہی کی زبان فیض ترجمان سے چاہتا ہوں۔

حضرت مرشد تھانویؒ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ۔

"قبول کرلینا چاہیے۔ حدیث ان اکرھت علیھا اعنت علیھا[2] میں وعدہ ہے۔

بحیثیت صدر مفتی دار العلوم دیوبند

مختصر یہ کہ ۲۸ ربیع الاول ۱۳۵۰ھ کو دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ[3] نے آپ کو منصب افتاء پر بحیثیت صدر مفتی فائز کر دیا۔ آپ حسب عادت پوری جانفشانی کے ساتھ اس مشکل ترین علمی کام میں منہمک ہو گئے۔ درس کا سلسلہ بھی جزوی طور پر جاری رہا۔ اس وقت آپ کا مشاہرہ پینتالیس روپے مقرر کیا گیا۔

آپ کے فتاویٰ پر نظر کرنے کے لئے آپ ہی خواہش پر آپ کے استاد و محترم سید میاں اصغر حسین صاحبؒ کو مامور کر دیا گیا تھا۔ اہم اور مشکل فتاویٰ میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ

---

[1] اس زمانہ میں والد صاحبؒ کے ذمہ اوپر کے درجات کے چھ اسباق تھے، ترجمہ قرآن کا درس ان کے علاوہ تھا۔ ہر درس میں تقریباً ڈیڑھ سو طلبہ شریک ہوتے تھے جن تک آواز پہنچانا ہی سخت محنت کا کام تھا۔ (مکاتیب حکیم الامت ص ۹۷، ۹۸، ۱۵۴ مخطوطہ)

[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ: اگر تمہیں کسی منصب کے لئے مجبور کیا جائے تو قبول کر لینے میں مضائقہ نہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری مدد کی جائیگی" رفیع

[3] مراسلہ ۲/۱۷ دفتر اہتمام (دار العلوم دیوبند قلمی) مؤرخہ ۲ ربیع الثانی ۱۳۵۰ھ نیز مقدمہ فتاویٰ دار العلوم دیوبند (ص ۹۔ ۱۱ مخطوطہ کراچی)

سے مشوروں کا سلسلہ زبانی اور بذریعہ خط و کتابت جاری رہتا تھا مگر اس زمانے کے کاغذات جو حضرت والد صاحب ؒ کے پاس محفوظ تھے اور اب احقر کے سامنے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ میاں صاحب ؒ کے نظر فرمانے کا سلسلہ کچھ زیادہ عرصہ تک باقاعدگی سے جاری نہیں رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد ہی آپ کے فتاویٰ پر بزرگوں کو اتنا اعتماد ہو گیا تھا کہ آگے اس کی ضرورت نہ سمجھی گئی، البتہ حضرت والد صاحب ؒ کو جب ذرا موقع ملتا یا کسی فتویٰ میں ادنیٰ تردد ہوتا تو ان بزرگوں سے پورے اہتمام کے ساتھ استفادہ فرماتے رہتے۔

اس ذمہ داری کے متعلق آپ کے تاثرات اور طریق کار

ان نئی ذمہ داریوں کے متعلق آپ کا تاثر اور طریق کار اس مکتوب گرامی سے واضح ہوتا ہے جو آپ نے حکیم الامت حضرت تھانوی ؒ کی خدمت میں ۲۴ صفر ۱۳۵۰ھ کو تحریر فرمایا۔ اس خط پر پڑی ہوئی تاریخ ہی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے آپ کے دارالافتاء میں تبادلہ کا باضابطہ فیصلہ اگرچہ ربیع الاول ۱۳۵۰ھ میں کیا مگر عملاً یہ ذمہ داریاں آپ صفر ۱۳۵۰ھ ہی میں سنبھال چکے تھے۔ خط میں تحریر فرماتے ہیں[1] کہ۔

"فتویٰ کا کام فی نفسہ سخت مشکل ہے بالخصوص مدرسہ دیوبند میں کہ یہاں فتاویٰ کی کثرت بھی ہے اور لوگ اہم فتاویٰ کو یہاں بھیجتے ہیں پھر یہاں فتاویٰ لکھنے کا ایک خاص طرز پڑا ہوا ہے۔ اس میں مفتی پر کام بہت بڑھ جاتا ہے۔ بایں وجوہ ابتداء میں طبیعت گھبراتی تھی، مگر تھانہ بھون سے واپسی کے بعد ہی سے حضرت والا کی عنایات اور توجہ کا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہو رہا ہے کہ الحمدللہ زیادہ الجھن نہیں ہوتی، جس مسئلہ کی تلاش ہوتی ہے وہ آسانی سے مل جاتا ہے اور جس میں شفا نہیں ہوتی، اکابر دارالعلوم سے تحقیق کر لیتا ہوں۔ بہر حال یہ جو کچھ ہوا حضرت کی دعاء و توجہ کا نتیجہ ہے اور آگے بھی اسی کا محتاج ہوں۔"

حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو ہر کام نہایت مستعدی، احساس ذمہ داری، احتیاط اور پھرتی سے نمٹانے کی عادت تھی۔ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء سے جو فتاویٰ جاری ہوتے تھے۔ آپ کے دارالافتاء میں منتقل ہوتے ہی ان کی تعداد اور کیفیت و ضخامت میں نمایاں اضافہ ہوا، جس کا اندازہ ان اعداد و شمار سے ہوتا ہے جو ۲۵ شوال ۱۳۵۸ھ میں

---

[1] مکاتیب حکیم الامت ص ۲۸ (مخطوطہ)

دفتر اہتمام کی ہدایت پر تیار کئے گئے تھے[1]، ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ہر سال فتاویٰ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا اور فتاویٰ زیادہ محققانہ اور مفصل بھی ہونے لگے۔ ۱۳۴۸ھ میں (یعنی یکم شوال ۱۳۴۸ھ سے ۳۰ رمضان ۱۳۴۹ھ تک ایک سال میں) دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء سے کل ۲۸۷۵ فتاویٰ جاری کئے گئے جو نقل فتاویٰ کے رجسٹر میں ۴۰۴ صفحات پر مشتمل تھے لیکن اگلے سال[2] کے وسط میں جب فتویٰ کا کام حضرت والد صاحب کے سپرد کیا گیا تو اس سال صرف چھ ماہ میں فتاویٰ کی تعداد میں ۶۶۱ کا اور رجسٹر کے صفحات میں نوّے کا اضافہ ہوا۔ پھر یہ اضافہ روز افزوں ہوتا گیا۔ ۱۳۵۲ھ میں فتاویٰ کی تعداد ۴۶۰۵ (چار ہزار چھ سو پانچ) اور صفحات رجسٹر کی تعداد ۷۶۸ ہوگئی جو سن ۴۸ھ کے مقابلے میں تقریباً دو چند ہے۔

اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے صرف چار سال کے عرصے میں بارہ ہزار سے زیادہ فتاویٰ تحریر فرمائے جن میں سے صرف ایک ہزار "امداد المفتین" کے نام سے شائع ہوئے، باقی دارالعلوم دیوبند کے رجسٹروں میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے تقریباً اڑتیس فتاویٰ اتنے مفصل اور تحقیقی انداز میں لکھے گئے ہیں کہ وہ مستقل رسالے بن کر کچھ "امداد المفتین" میں، کچھ "جواہر الفقہ"[3] میں اور کچھ الگ مستقل کتابچوں کی صورت میں شائع ہوئے۔ دارالافتاء میں دنیا بھر کے ممالک سے فقہی سوالات کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ خصوصاً جن پیچیدہ مسائل میں علماء کا باہمی اختلاف رائے ہوتا وہ بھی فیصلہ کے لئے یہیں آتے تھے حضرت والد صاحبؒ فریقین کی آراء اور دلائل و تحقیقات کا تنقیدی جائزہ لے کر اپنی تحقیق اور فیصلہ تحریر فرماتے۔ فتاویٰ کی مذکورہ بالا تعداد میں ایسے فتاویٰ بھی بکثرت ہیں۔

استعفاء کی خواہش اور خشیت و تواضع

آپ کے فتاویٰ اور فقہی تحقیقات کو اس زمانہ کے فقہاء ارباب فتویٰ اور آپ کے

---

[1] ان کی ایک نقل حضرت والد صاحبؒ کے کاغذات میں محفوظ تھی جو اس وقت احقر کے سامنے ہے۔ رفیع

[2] دارالعلوم کا تعلیمی سال مراد ہے جو یکم شوال سے شروع ہوتا ہے۔

[3] یہ کتاب حضرت والد صاحبؒ کے چوالیس فقہی رسائل کا مجموعہ ہے۔ دو جلدوں میں مکتبہ دارالعلوم کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ رفیع

بزرگوں نے جس انداز میں سراہا اور دل کھول کر داد اور دعائیں دیں اس کی تفصیلات بہت ہیں جن کا یہ موقع نہیں مگر حضرت والدؒ کی خشیت اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت اس فکر سے پریشان رہتے کہ کسی فتوے میں غلطی نہ ہو جائے چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے نام ایک خط (مؤرخہ ۱۴ رمضان ۱۳۵۰ھ) میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اس وقت فتویٰ لکھنا ایک پہاڑ معلوم ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام میرے بس کا نہیں، اس لئے حیران ہوں کہ کیا کروں؟ کیا یہ درخواست کروں کہ مدرسہ والے مجھے اس سے معافی دیں اور پھر درس میں لے لیا جائے؟ کیونکہ وہاں غلطیاں چل نہیں سکتیں شاید دیانۃً میرے لئے بہ نسبت اس کام کے وہ کام زیادہ اچھا ہو؟"

مرشد تھانویؒ نے تسلی دی کہ:

"جب اللہ تعالیٰ نے خشیت کا یہ غلبہ دیا ہے تو اعانت بھی ہوگی جیسا احادیث میں وعدہ ہے۔ اگر مدت معتد بہا کے بعد اس کی ضرورت محسوس ہوگی۔ بعد میں مشورہ ہر وقت ممکن ہے[1]"

اپنے مرشد اور بزرگوں کی ایسی ہی تسلیوں اور ہدایات کی بنا پر آپ اس کام میں جانفشانی سے لگے رہے مگر یہ سمجھنے کے لئے آپ کسی طرح تیار نہ تھے کہ اس کام کی اہلیت بھی میرے اندر ہے۔ اسی خشیت و تواضع کا غلبہ تھا جس نے مقدمہ[2] امداد المفتین میں آپ سے یہ لکھوایا ہے کہ:

"میں اپنی علمی بے بضاعتی سے بے خبر تو نہ تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کام کے لئے علم کے جس پایہ و منزلت کی ضرورت تھی اس سے پورا واقف بھی نہ تھا تعلیمی خدمتوں کی طرح حضرات اساتذہ اور بالخصوص سیدی و استاذی حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی قدس سرہ کی امداد و اعانت کے بھروسہ اس بار کو سر پر اٹھا لیا۔ کئی سال تک کام کرنے کے بعد اس علم تک رسائی ہوئی کہ یہ کام مجھ جیسے بے بضاعت و بے لیاقت لوگوں کا نہیں"

سمجھے اتنا کہ کچھ نہ سمجھے ہائے
سو بھی ایک عمر میں ہوا معلوم

---

[1] مکاتیب حکیم الامت ص ۷۷ (مخطوطہ)

[2] مقدمہ فتاویٰ دار العلوم دیوبند (امداد المفتین) ص ۱۱-۱۲

تحقیق و تنقید اور اختلاف رائے کا اسلوب

فتویٰ کی ذمہ داری آجانے کے بعد حضرت حکیم الامتؒ سے خط و کتابت کا رنگ بھی خاصا بدل گیا تھا۔ ان خطوط میں بڑا حصہ پیچیدہ فقہی تحقیقات نے لے لیا تھا۔ بعض اوقات کسی مسئلہ کی تحقیق میں مرشد و مرید کا اختلاف بھی ہو جاتا۔ صفحے کے صفحے اپنے اپنے دلائل اور اشکالات کے جواب میں بذریعہ خطوط لکھے جاتے' کبھی مرید اپنے مرشد کی تحقیق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا' کبھی مرشد مرید کی تحقیق کو ترجیح دے کر اپنی رائے سے رجوع کر لیتا

اور اگر کبھی ایک دوسرے کے دلائل میں پورے غور و فکر اور باہمی مشوروں کے باجود اختلاف رائے باقی رہتا تو مسئلہ دریافت کرنے والے پر اختلاف کا اظہار کر دیا جاتا تاکہ اسے جس کے فتویٰ پر زیادہ اطمینان ہو اس کے مطابق عمل کرے۔

حضرت حکیم الامتؒ کے کسی فتویٰ پر اگر والد صاحبؒ کو کوئی اشکال ہوتا تو اسے طالب علمانہ اسلوب میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ مگر خوب مدلل انداز میں پیش فرماتے' اشکالات پیش کرنے کا انداز ایسا متواضعانہ اور مدلّل ہوتا کہ جواب میں مرشد کے قلم سے بے ساختہ دعائیں نکلتیں حسن نظر کی بھی داد ملتی' حسن بیان اور حسن ادب کی بھی۔

یہ سلسلہ جو خط و کتابت "مکاتیب حکیم الامت" میں محفوظ ہے تحقیق و تنقید' بے نفسی اور حق پرستی کا ایسا جیتا جاگتا نمونہ ہے کہ آج کی دنیا میں اس کی مثالیں نایاب ہیں۔ آج کل تو دعووں اور اظہار برتری کا نام علمی تحقیق رکھ دیا گیا اور جملہ بازی اور دوسرے کی تنقیص و تذلیل کو تنقید کا مقدس نام دے دیا گیا ہے۔ کسی سے عقیدت ہو تو "اینک ماہ و پروین" کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں عقیدت نہ ہو تو اس کی ہر دلیل صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے۔ جو بات ایک مرتبہ زبان یا قلم سے نکل گئی' پتھر کی لکیر بن کر وقار کا مسئلہ بن جاتی ہے۔ لیکن یہ سب باتیں نفسانیت کی پیداوار ہیں اور جہاں فریقین کا مقصود ہی حق کی تلاش ہو وہاں یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ کہنے والا میری رائے کے موافق کہہ رہا ہے یا مخالف' وہاں نظر اس پر رہتی ہے کہ کیا کہہ رہا ہے کس دلیل سے کہہ رہا ہے چنانچہ حضرت حکیم الامتؒ کے یہاں جو فتاویٰ کا سلسلہ جاری تھا۔ ان میں آپ نے ایک مستقل باب "ترجیح الراجح" کا

رکھا تھا' اس باب میں وہ فتاویٰ درج کئے جاتے تھے جن سے حضرت نے کسی کی توجہ دلانے سے یا خود ہی تحقیق بدل جانے کے باعث رجوع کرلیا ہو۔ اسی طرح حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے مجموعہ فتاویٰ میں ایک مستقل باب "اختیار الصواب" کے نام سے اس غرض کے لئے مقرر کیا ہوا تھا' اگر دوسرے کی تحقیق پر دیانت دارانہ طور پر دل مطمئن ہو جائے تو ان حضرات کو اپنی سابقہ رائے سے رجوع کرنے میں کوئی دشواری تو کیا محسوس ہوتی والہانہ طور پر احسان مند ہوتے تھے' جیسے پیاسے کو پانی مل گیا ہو' احقر نے حضرت والد صاحبؒ کا ہمیشہ یہی رنگ دیکھا ہے۔ سلف صالحین' صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کا یہی رنگ تھا اور اسی کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی' واقعہ یہ ہے کہ جب تک ان حضرات کی تحقیق و تنقید کا نمونہ سامنے نہ ہو دل میں تحقیق و تنقید کا تقدس پیدا ہونا ہی مشکل ہے۔

خود رائی اور خود بینی سے والد صاحبؒ کو سخت نفرت تھی' روزمرہ کے عام معاملات میں بھی اپنے چھوٹوں تک سے مشورہ لینے کے عادی تھے بالخصوص فتویٰ جو دنیا و آخرت کی نازک ذمہ داری تھی اس میں تو سب ہی بزرگوں سے اور خصوصاً حضرت حکیم الامتؒ سے استفادہ کرنے کا کوئی موقع فروگذاشت نہ فرماتے تھے۔ یہ استفادہ بیس سال جاری رہا۔ اپنے اساتذہ اور بزرگوں کی عظمت و عقیدت آپ کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ آپ نے کبھی اس عقیدت کو مسائل کی تحقیق و تنقید میں حائل نہیں ہونے دیا اور نہ کبھی اپنی تنقید سے کسی کی عظمت و عقیدت پر حرف آنے دیا۔ آج کسی سے عقیدت اور اسی پر علمی تنقید کو اگرچہ باہم متعارض سمجھا جاتا ہو لیکن حضرت والد صاحب قدس سرہ ان دونوں متعارض باتوں کو ہمیشہ ساتھ لے کر چلنے کے عادی رہے۔ ایسا کرنا مشکل ضرور ہے لیکن اس مشکل کو آپ نے جس خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ اہل علم کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کے سب بزرگوں کو آپ کی علمی تحقیقات پر اعتماد اور آپ کی ذات سے محبت اور شفقت میں اضافہ ہوتا گیا۔

آپ نے فتویٰ کا کام اس جانفشانی کے ساتھ جاری رکھا کہ دارالعلوم کی طرف سے تو صرف چھ گھنٹہ کی پابندی تھی مگر آپ روزانہ[1] دس بارہ گھنٹے اس میں لگاتے تھے۔ تصنیف

---

[1] مکاتیب حکیم الامت ص ۸۴ (مخطوطہ)

وتدریس کا سلسلہ بھی ساتھ جاری تھا۔

ایک خواب

اسی زمانہ میں رام پور کے ایک عالم دین حضرت مولانا محمود صاحب نے خواب دیکھا کہ دارالافتاء میں جہاں حضرت والد صاحب بیٹھتے ہیں وہاں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ آرام فرما رہے ہیں[1]۔ یہ معلوم ہی ہے کہ حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ فقہ اور فتویٰ میں تمام علماء دیوبند کے امام سمجھے جاتے تھے' اور اسی لئے ان کو اپنے زمانے کا ابو حنیفہ کہا جاتا ہے۔

ایک فتویٰ کے خلاف ملک گیر فتنہ

اسی زمانے میں ایک فتنہ یہ پیش آیا کہ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء میں ایسے سوالات کی کثرت ہوگئی جن میں نسب کے متعلق عوام کی بے اعتدالیوں اور افراط و تفریط کے متعلق شرعی احکام دریافت کئے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں بنیادی طور پر تین قسم کی بے اعتدالیاں سامنے آئیں جو مسلم معاشرے میں پھیلی ہوئی تھیں (۱) بعض لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے خاندانی شرافت عطا فرمائی تھی' اپنے نسب پر بے جا فخر وغرور اور دوسروں کی تحقیر کرنے لگے اور اپنے اعمال واخلاق سے بے پروا ہو کر صرف اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے کہ ہم فلاں بزرگ یا فلاں بادشاہ کی اولاد میں ہیں (۲) ان کے مقابلے میں بعض دوسری برادریاں اس کے درپے ہوگئیں کہ اپنے آپ کو اصلی نسب کے بجائے کسی اونچے نسب کی طرف منسوب کرنے لگیں۔ اسلام میں یہ دونوں باتیں حرام ہیں۔ بعض مسائل میں شریعت نے انساب کے تفاوت کا اعتبار ایک حد تک ضرور کیا ہے مگر اصل کرامت وفضیلت کا مدار تقویٰ اور پرہیز گاری پر رکھا ہے۔ ادھر اپنے اصلی نسب پر پردہ ڈال کر خود کو کسی دوسرے نسب کی طرف منسوب کرنا بھی حرام ہے۔ احادیث میں اس پر سخت وعیدیں آئی ہیں۔

ان دونوں کے مقابلے میں ایک تیسری جماعت نے انساب اور پیشوں کے باہمی تفاوت کا نکاح وغیرہ کے ان مسائل میں بھی سرے سے انکار شروع کردیا جن میں شریعت نے

---

[1] مکاتیب حکیم الامت ص ۸۰ (مخطوطہ)

اسے معتبر مانا ہے، ان لوگوں نے اسلامی مساوات کا یہ مفہوم تراشا کہ نکاح میں کفاءت کا اعتبار غیر ضروری ہے۔ ہر مرد ہر عورت کے لئے کفو ہے خواہ دونوں کے نسب اور خاندانی پیشوں میں زمین و آسمان کا تفاوت ہو۔ یہ بات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات اور شرعی احکام کے خلاف تھی۔

جب دارالافتاء میں ان بے اعتدالیوں کے متعلق سوالات کی کثرت ہوئی تو حضرت والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ نے اس وقت کے دارالعلوم کے سرپرست حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے مشورہ سے ایک رسالہ تالیف فرمایا جس کا عربی نام "نہایات الادب فی غایات النسب" اور اردو نام "اسلام اور نسبی امتیازات" ہے۔ پورا رسالہ شگفتہ اردو میں ہے۔ ۸ رجب ۱۳۵۱ھ کو اس کی تالیف مکمل ہوئی اور اسی سال شائع ہوگیا۔ اس رسالہ میں آپ نے مندرجہ ذیل مسائل کی تشریح اپنے مخصوص معتدل فقہی انداز میں فرمائی۔

۱۔ اسلام اور نسبی امتیازات

۲۔ اسلامی مساوات کی حقیقت

۳۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک فضیلت کا مدار تقویٰ پر ہے

۴۔ معاملات نکاح میں نسب اور پیشوں کا تفاوت ہے۔

۵۔ غیر کفوء میں نکاح کی شرعی حیثیت

۶۔ اونچے نسب پر فخروغرور کی حرمت۔

۷۔ خود کو اپنے اصلی نسب کے بجائے کسی دوسرے نسب سے منسوب کرنا حرام ہے۔

اس موضوع پر اردو میں یہ پہلا جامع اور تحقیقی رسالہ تھا، علمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔ آپ کے اساتذہ اور اکابر علماء نے اس پر تقریظیں لکھیں۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے تو اس پر گیارہ صفحات کی اتنی مفصل تقریظ تحریر فرمائی کہ وہ خود ایک رسالہ کی صورت اختیار کر گئی، جو "وصل السبب فی فصل النسب" کے نام سے اسی رسالہ کے ساتھ شائع ہوئی۔

ایک سازش

لیکن شخصیت جتنی باکمال ہو اتنے ہی اس کے حاسد بھی ہوتے ہیں۔ حضرت والد

صاحبؒ کو بھی حاسدوں کی ریشہ دوانیوں سے بہت ایذائیں پہنچیں اور آخر حیات تک پہنچتی رہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر علمی میدان میں جو تیز گام مقبولیت حاصل ہو رہی تھی حاسدوں کے لئے ناقابل برداشت تھی انہوں نے رسالہ "اسلام اور نسبی امتیازات" کی تألیف سے پہلے بھی آپ کو ایک فتویٰ کے سلسلے میں بدنام کرنے کے لئے سازش کا جال تیار کیا تھا۔ جس کا تانا بانا مسلسل تین ماہ کی جدوجہد سے بنا گیا تھا مگر حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمتہ اللہ علیہ کو بروقت علم ہو گیا اور انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے روبرو اس ناپاک سازش کی تفصیلات[1] بتا کر اس کا تار پود بکھیر دیا۔ والد صاحبؒ کو اس سازش کا علم بعد میں ہوا۔

رسالہ "اسلام اور نسبی امتیازات" شائع ہوا تو حاسدوں کی کینہ پرور صلاحیتیں پھر حرکت میں آئیں۔ اس مرتبہ ان کو کچھ سیاسی لوگوں کا تعاون بھی حاصل ہو گیا تھا۔ نیز آریوں اور عیسائی پادریوں نے بھی اس فتنہ کو ہوا دی[2]۔ صنعت پیشہ برادریوں کو بھکایا گیا کہ "مفتی صاحب نے تم سب کے دوزخی ہونے کا فتویٰ دے دیا ہے۔" ان سادہ دل عوام کو رسالہ کی بعض عبارتیں سیاق وسباق سے کاٹ کر سنائی گئیں اور بعض عبارتیں خود ایجاد کر کے والد صاحب کی طرف منسوب کر دی گئیں، یہ کام دیوبند میں بھی ہوا اور دیوبند سے باہر بھی۔

ایک لطیفہ

فتنہ پردازوں نے کتنی کاوش سے کام لیا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ بلکہ لطیفہ سے ہو گا کہ اس رسالہ کی طباعت کے وقت پریس کی غلطی سے بعض فرمے غلط چھپ گئے، ان کی لوٹ غلط ہو جانے کے باعث ایک صفحہ پر جو مضمون تھا وہی اگلے صفحے پر مکرر چھپ گیا۔ مجبوراً دو دو ورق باہم چپکا کر ایک ورق بنایا گیا۔ بعض لوگوں نے اس میں یہ نکتہ پیدا کیا کہ ان چپکے ہوئے صفحات میں صنعت پیشہ برادریوں کے خلاف گالیاں لکھی ہوں گی۔ اسی لئے انہیں چپکایا گیا ہے کہ ہر ایک نہ پڑھ سکے۔ یہ سن کر بعض لوگ اس دردسری میں مبتلا ہو گئے کہ

---

[1] مکاتیب حکیم الامت ص ۸۲ (قلمی)

[2] مکاتیب حکیم الامت ص ۱۱۷ (قلمی)

اس رسالہ کے نسخے خرید کر چپکے ہوئے صفحات ایک دوسرے سے بمشکل چھڑاتے اور اندر کا مضمون پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ منظم سازش کامیاب ہوئی اور ملک کے کتنے ہی علاقوں سے مخالفانہ قراردادیں پاس ہو کر دیوبند آنے لگیں۔ نئے نئے اخبارات غم وغصہ کے اظہار کے لئے جاری ہوئے۔ جلسے، جلوس، دھمکیاں اور قتل کے منصوبے روز کا معمول بن گئے۔ یہ سلسلہ ۱۳۵۳ھ کے اوائل سے ۱۳۵۴ھ کے اواخر تک جاری رہا...... اس رسالہ پر جو بہتان لگائے گئے تھے چونکہ صرف عناد ان کا محرک تھا اس لئے حضرت تھانویؒ نے والد صاحبؒ کو خط میں لکھا کہ:

"کسی بات کا جواب نہ دیا جائے۔ انشاء اللہ فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ، فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ کا ظہور ہوگا۔ بچوں کو لے کر سلام ودعا" [1]

بے نفسی اور غم خواری

مگر جب یہ محسوس ہوا کہ بے چارے سادہ دل عوام کو رسالہ کے اصل مضمون کی خبر نہیں صرف افواہوں سے متاثر ہو کر اس رنج وغم میں مبتلا ہوئے ہیں کہ ہمارے پیشہ کے خلاف لکھا گیا ہے۔ تو والد ماجدؒ نے حکیم الامت حضرت تھانویؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحبؒ کے مشورہ سے ایک تسلی آمیز مضمون شائع کر کے حقیقت حال کو واضح کیا اور مطبوعہ رسالہ کی اشاعت بالکل روک دی۔ ناشر چونکہ خود والد صاحبؒ تھے۔ اس کا مالی نقصان بھی آپ پر پڑا مگر عوام کی دلجوئی کے لئے اسے برداشت فرمایا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ مخالفین نے جن عبارتوں سے عوام کو دھوکہ دے کر فتنہ پھیلایا تھا ان میں ترمیم کر کے رسالہ دوبارہ شائع کیا تاکہ اب کسی لفظ سے عوام کو غلط فہمی میں مبتلا نہ کیا جاسکے۔ [2]

مگر جن لوگوں نے اس رسالہ کا پہلا ایڈیشن تعصب کے بغیر پڑھا تھا وہ پہلے بھی شاکی

---

[1] مکاتیب حکیم الامتؒ صفحہ ۱۱۵ مورخہ ۱۴ جمادی الاولی ۱۳۵۳ھ

[2] مکاتیب حکیم الامتؒ ۱۲۷ (مخطوطہ)

ہونے کے بجائے اس رسالہ کے مداح تھے حتیٰ کہ جن برادریوں میں غم وغصہ پھیلایا گیا تھا انہی برادریوں کے لوگوں نے اس رسالہ کی حمایت میں مضامین[1] شائع کئے لیکن جنہوں نے دوسرا ایڈیشن بھی فساد انگیزی ہی کی نیت سے پڑھا یا پڑھے بغیر محض افواہوں پر اعتماد کر بیٹھے ان کی فتنہ سامانیوں میں فرق نہ آیا۔

آپ کی طرف سے اکابر علماء کی مدافعت

یہ تو ہمیشہ ہوتا آیا ہے کہ کسی مصنف پر مخالفین نے ناحق اعتراضات کئے تو اسکے شاگردوں یا بعد کے علماء نے اس کا علمی دفاع کیا اور مدافعت میں کتابیں تصنیف کیں لیکن ایسی مثالیں مشکل سے ملیں گی کہ مصنف کے اساتذہ اور بزرگوں نے اس کی مدافعت میں تصنیفیں لکھی اور مناظرے کئے ہوں۔ حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ یہ دوسری ہی صورت پیش آئی، جس کی کچھ تفصیل یہ ہے۔

آپ کی حمایت میں حکیم الامتؒ کا رسالہ

فتنہ حد سے بڑھا تو حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے علاوہ اس محققانہ تقریظ کے جو رسالہ کے پہلے ہی ایڈیشن میں چھپ چکی تھی۔ رجب ۱۳۵۳ھ میں ایک مستقل رسالہ بنام "رفع الغلط لدفع الشطط"[2] تصنیف فرمایا، جس میں والد صاحب کی عبارات نقل کرکے واضح فرمایا کہ بعض برادریوں کے متعلق جو بات مفتی صاحب کی طرف منسوب کی گئی ہے سراسر بہتان ہے کوئی شخص اس گھڑے ہوئے مضمون کو پورے رسالہ میں نہیں دکھلا سکتا اور جو بات مفتی صاحب نے لکھی ہے وہ احادیث نبویہ اور تصریحات فقہاء کے عین مطابق ہے۔ ان سے کسی قوم یا برادری کی دل آزاری کا جو افسانہ گھڑا گیا ہے اس کی حقیقت افسانہ سے زیادہ کچھ نہیں۔

---

[1] مکاتیب حکیم الامت" صفحہ ۱۲۱ مورخہ ۱۹ جمادی الثانیہ ۱۳۵۳ھ (مخطوطہ)

[2] یہ رسالہ حضرت والد صاحبؒ کے رسالہ "اسلام اور نسبی امتیازات" کے ساتھ جواہر الفقہ جلد دوم میں بھی طبع ہو گیا ہے۔

حضرت مولانا اصغر حسین صاحبؒ کی تالیف

والد صاحبؒ کے استاذ محترم حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحبؒ نے بھی ایک رسالہ تالیف فرمایا[1] جس میں اپنے مضامین کے علاوہ کچھ دوسرے علماء کرام کے مضامین بھی جمع فرمادیئے جو والد صاحبؒ کے رسالہ کی تائید میں لکھے گئے تھے۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کی تقریر اور مخالفین سے مناظرہ

دیوبند میں ان تمام برادریوں کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جن کو والد صاحبؒ کے خلاف مشتعل کیا گیا تھا اس جلسہ میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحبؒ مدنی کی تقریر کا انتظام بعض سیاسی عناصر نے اس مقصد سے کیا تھا کہ اپنے مفید طلب کوئی بات کہلوا سکیں مگر حضرت مدنیؒ نے اپنی تقریر میں والد ماجد صاحبؒ کے رسالہ کی اول سے آخر تک ایسی تائید وحمایت فرمائی کہ والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں خود بھی ایسی نہ کر سکتا۔ تقریباً چار گھنٹے تقریر اور ایک گھنٹہ مسلسل لوگوں کے سوال و جواب کا سلسلہ رہا۔ حضرت مدنیؒ سب کا جواب اسی رسالہ کی عبارات پڑھ پڑھ کر دیتے رہے۔[2]

مخلصین کی جانثاری

اس پر آشوب دور میں ہر وقت آپ کی جان کو خطرہ لاحق تھا۔ قتل کے منصوبے آئے دن کا معمول بنے ہوئے تھے' اعزہ و احباب فکرمند اور آپ کے ضعیف والد صاحب سخت بے چین تھے' جو اپنے قابل فخر اکلوتے بیٹے ہی کو زندگی کی کمائی سمجھتے تھے۔

گھر سے دارالعلوم کے راستہ میں ایک ایسی برادری کا محلّہ بھی آتا تھا جو آپ کے

---

[1] مکاتیب حکیم الامتؒ ص ۷ ۱۲ مورخہ ۲ رمضان ۱۳۵۳ھ (مخطوطہ)

[2] مکاتیب ص ۱۲۲ (مخطوطہ)

خلاف سرگرمیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ مگر حضرت والد صاحبؒ نے راستہ تبدیل کرنا دینی غیرت کے خلاف سمجھا۔ تن تنہا بے خطر آتے جاتے رہے۔ دیوبند کی بھاری اکثریت آپ سے عقیدت و محبت رکھتی تھی۔ مخلصین و معتقدین کی ایک جماعت ہر وقت جانثاری کے لئے تیار تھی۔ ان میں والد صاحبؒ کے شاگرد رشید حضرت مولانا عرض محمد صاحب بانی و مہتمم مدرسہ مطلع العلوم کوئٹہ جو اس وقت دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے والد صاحبؒ کو بتائے بغیر یہ معمول بنالیا تھا کہ جہاں والد صاحبؒ جاتے کچھ فاصلے سے یہ بھی ہاتھ میں لٹھ لئے پیچھے پیچھے ہو لیتے۔ والد صاحبؒ کو کئی دن بعد اس کا علم ہوا[1]۔

ان کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے شعبہ فارسی و ریاضی کے صدر مدرس جناب خلیفہ محمد عاقل صاحب مرحوم اور ناچیز راقم الحروف کے تین ماموں (۱) جناب فضل کریم صاحب انصاری (۲) جناب احمد کریم صاحب انصاری (۳) اور جناب مولانا انوار کریم صاحب انصاری ان جانثاروں میں سے ہیں جنھوں نے اس زمانہ میں سارے مشاغل چھوڑ کر والد صاحب کی حفاظت کو مقصد حیات بنالیا تھا۔

فتویٰ سے تدریس کی طرف منتقلی

پیچھے تفصیل بیان ہو چکی ہے کہ جب دارالعلوم کے ارباب انتظام کی طرف سے فتویٰ کی ذمہ داریاں پیش کی گئیں تو عرصہ تک آپ کو خرابی صحت وغیرہ کے باعث تردّد رہا، لیکن بزرگوں کے حکم پر قبول فرمالیا تھا۔ پھر بعد میں بھی حضرت حکیم الامت سے اجازت طلب فرمائی کہ ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر تدریس میں واپس چلے جائیں مگر اجازت نہ ملی۔

جب سے یہ فتنہ اٹھا تھا اس وقت سے تو آپ مسلسل ہی اس کی کوشش فرماتے رہے مگر اکابر دارالعلوم نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ آپ کے ایک خط کے جواب میں حکیم الامت حضرت تھانوی ؒ نے جو اس وقت دارالعلوم کے باضابطہ سرپرست تھے، تحریر فرمایا[2] کہ

---

[1] احقر تو اس وقت پیدا بھی نہ ہوا تھا۔ ایک مرتبہ مولانا موصوف کراچی تشریف لائے تو والد صاحبؒ نے ان کا تعارف کراتے ہوئے یہ واقعہ سنایا (رفیع)

[2] مکاتیب حکیم الامتؒ ص ۱۴۵ (مخطوطہ)

"آخر میں پھر اسی جملہ کا اعادہ کرتا ہوں کہ آپ حق پر ہیں آپ کو پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ اَللّٰہُ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ"

یہ فتنہ درحقیقت دارالعلوم دیوبند کے خلاف تھا والد صاحبؒ کی ذات کو محض بہانہ کے طور پر ہدف بنایا گیا تھا' چنانچہ اب مخالفین کھل کر دارالعلوم کے خلاف کارروائیاں کرنے لگے تھے۔ والد صاحب کو یہ صورتحال کیسے برداشت ہوتی آپ نے پھر اصرار فرمایا۔ بالآخر تقریباً شعبان ۱۳۵۴ھ میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے یہ مشکل فیصلہ بھی کردیا کہ آپ کو فتویٰ سے تدریس کی طرف منتقل کردیا جائے۔[1]

یہ فیصلہ مشکل اس لیے تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے فتویٰ کا جو اعلیٰ معیار بزرگوں سے چلا آرہا تھا اور جس کی تجدید والد صاحب نے فرمائی تھی اب اس کا متبادل انتظام سامنے نہ تھا مجبوراً فتاویٰ کا کام کچھ عرصہ نائب مفتی صاحب ہی چلاتے رہے۔ اہم اور مشکل فتاویٰ میں حضرت والد صاحبؒ سے مراجعت[2] فرمالیتے تھے مگر چند سال گزر جانے کے باوجود جب دارالافتاء کا کوئی مستقل اطمینان بخش انتظام نہ ہوسکا تو فتویٰ کی ذمہ داریاں آپ کو دوبارہ سونپ دی گئیں جس کی کچھ تفصیل چند اوراق کے بعد آئے گی۔

عارضی طور پر تدریس میں منتقلی کے باوجود آپ کے مشغلہ افتاء کا تسلسل برابر جاری رہا' آپ کی ذاتی ڈاک میں جو سوالات آتے ان کا جواب بہرحال لکھنا ہی پڑتا تھا حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا بھی یہ معمول جاری تھا کہ انکے پاس جو زیادہ تحقیق طلب سوالات آتے وہ جواب کے لئے والد صاحبؒ کے پاس دیوبند بھیجتے تھے نیز اپنے ذاتی معاملات اور خاص اعزہ واحباب کے معاملات میں بھی عموماً فتویٰ حضرت والد صاحبؒ سے طلب فرماتے تھے۔

آپ کے فتاویٰ، حکیم الامتؒ کی نظر میں

حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کو آپ کے فتاویٰ پر کتنا اعتماد تھا' اس کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو مکاتیب حکیم الامت میں محفوظ ہیں' ایک مثال ملاحظہ ہو۔

---

[1] مکاتیب حکیم الامتؒ ص ۱۴۶ (مخطوطہ)

[2] مکاتیب حکیم الامتؒ ص ۱۵۳ (غیر مطبوعہ)

حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے ایک استفسار کا جواب والد صاحبؒ نے لکھ کر بھیجا۔ اور خط میں لکھا کہ

"جس سوال کی تحقیق مطلوب تھی، اسی روز اسے کچھ دیکھا، مگر پورا نہ ہوا تھا کہ مجھے ایک ضروری سفر پیش آگیا، دو تین روز اس میں صرف ہو گئے۔ آج جو کچھ سمجھ میں آسکا پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ اس کے خطا و صواب سے مطلع فرمایا جائیگا، اور اگر کوئی جزو اور قابل تحقیق باقی رہ گیا ہو تو اس پر متنبہ فرمایا جائے گا۔"

"دو مسرتیں ہوئیں اور دونوں بالغہ سابغہ، ایک شبہ کا ازالہ، دوسرے اپنی آنکھ سے دین کی صحیح خدمت کرنے والے کا مشاہدہ، جس سے امید بندھ گئی کہ انشاء اللہ تعالیٰ امت کے دستگیر ابھی باقی رہیں گے، دل سے دعاء برکت ظاہرہ وباطنہ کی کرتا ہوں۔"

برخوردار[1] کی صحت کاملہ کے لئے دعا کرتا ہوں، باقی الحمد للہ یہاں بھی خیریت ہے۔ میں نے ایک رسالہ حصص کمپنی کے احکام میں لکھا ہے۔ آپ کا جواب اس کا ایک جز ہو کر (ماہنامہ) "النور" میں جلد چھپے گا۔"

ماہنامہ "المفتی"

تدریس و افتاء تصنیف و تالیف کی مصروفیات کے ساتھ آپ نے ایک علمی ماہنامہ "المفتی" بھی محرم ۱۳۵۴ھ میں جاری فرمایا، آپ اس کے مالک و مدیر تو تھے ہی، ناظم و ناشر بلکہ محرر و چپراسی کا کام بھی خود کرنا پڑتا تھا، کوئی ہاتھ بٹانے والا نہ تھا، اتنی مالی گنجائش نہ تھی کہ کوئی ملازم رکھ سکیں۔

اس زمانہ میں علماء دیوبند کے فتاویٰ اور علمی تحقیقات شائع کرنے والا کوئی پرچہ دیوبند میں جاری نہ تھا۔ دارالعلوم دیوبند کا دارالافتاء پوری دنیا میں فتویٰ کا مرکز سمجھا جاتا تھا مگر یہاں سے جاری ہونے والے فتاویٰ سے صرف وہی شخص استفادہ کرسکتا تھا جس نے یہ فتویٰ

---

[1] احقر کے بھائی جان جناب محمد زکی کیفی صاحب مراد ہیں جن کی عمر اس وقت تقریباً پندرہ سال تھی اس زمانہ میں بیمار تھے۔ رحمتہ اللہ علیہ (رفیع)

[2] مکاتیب حکیم الامتؒ ص ۲۱۲ (قلمی)

طلب کیا ہو' کیونکہ دارالافتاء کے رجسٹروں میں فتاویٰ کی نقل تو محفوظ رکھی جاتی تھی ، ان کی اشاعت کا انتظام نہ تھا۔

حضرت والد صاحبؒ کے پیش نظراس رسالہ کا بڑا مقصد یہ تھا کہ اس میں ان فتاویٰ کو ترتیب وتبویب کے ساتھ شائع کیا جائے۔ اسی لئے اس کا نام "المفتی" رکھا گیا۔ چنانچہ رسالہ المفتی میں آٹھ صفحے ان فتاویٰ کے لئے رکھے گئے جو مفتی اعظم ہند حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب نے اپنے دور میں تحریر فرمائے تھے اور ان کا نام "عزیز الفتاویٰ" رکھا گیا اور آٹھ صفحے ان فتاویٰ کے لئے رکھے گئے جو حضرت والد صاحبؒ کے تحریر فرمودہ تھے اور نام حضرت تھانویؒ نے "امداد المفتین" تجویز فرمایا۔

یہ رسالہ سخت مالی مشکلات کے باوجو آٹھ سال تک جاری رہا اور علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوا' اس میں فتاویٰ کے یہ دونوں سلسلے باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے پھر المفتی میں شائع ہونے والے یہی فتاویٰ کتابی شکل میں "فتاویٰ دارالعلوم دیوبند" کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے۔ جلد اول میں "عزیز الفتاویٰ" ہے اور جلد دوم میں "امداد المفتین" اس وقت یہ کتاب صرف عوام ہی کے لئے نہیں بلکہ مفتیان کرام کے لئے بھی ناگزیر سمجھی جاتی ہے' کوئی مفتی اس سے مستغنی نہیں۔

"المفتی" میں فتاویٰ کے علاوہ حضرت والد صاحبؒ کے دیگر علمی ' ادبی' تاریخی واصلاحی مضامین کا بھی نہایت گراں قدر علمی سرمایہ شائع ہوا جس میں اردو' فارسی' عربی ' تینوں ہی زبانوں کے علمی جواہر پارے موجود ہیں' کہیں نظم کی صورت میں کہیں نثر کی صورت میں۔

آٹھ سال کے ان تمام پرچوں میں حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے جتنے اردو کے متفرق مضامین ' نظمیں اور اشعار شائع ہوئے' بحمد اللہ وہ تمام بلکہ کچھ اضافوں کے ساتھ اب ایک کتابی صورت میں "کشکول" کے نام سے شائع ہو گئے ہیں' یہ کتاب واقعی کشکول ہے۔ اس میں پہلا حصہ نثر کا اور دوسرا نظم کا ہے' نثر میں کہیں تاریخ کے دلچسپ وعبرتناک واقعات ہیں' کہیں خالص علمی تحقیقات' کہیں بزرگوں کے ایمان افروز ملفوظات۔ اس کا ہر مضمون دوسرے سے الگ ہے۔ قاری جہاں سے کھول کر پڑھنا شروع کردے محظوظ ومستفید ہوتا ہے' حصہ نظم میں قصیدے ' مرثیے' قطعات' غزلیں وغیرہ ہیں' یہ حصہ دیکھ کر قاری کو پہلی

تھانہ بھون بھی عرصہ تک حاضری نہ ہو سکی۔ شب و روز اپنے والد کی خدمت میں لگے رہے اور دعائیں لیتے رہے۔ بالآخر ۹ صفر ۱۳۵۵ھ کو بروز جمعہ آپ کے والد صاحب نور اللہ مرقدہ کی وفات ہو گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اسی روز آپ نے حضرت حکیم الامت کی خدمت میں مندرجہ ذیل خط روانہ کیا :

اس حادثہ پر حکیم الامتؒ کے نام خط اور اس کا جواب[۱]

مؤرخہ........۹ صفر ۱۳۵۵ھ

مکتوب : "والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ کی حالت تو کئی روز سے نازک تھی، آج بروز جمعہ صبح ساڑھے سات بجے رحلت فرما گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون"

جواب : "انا للہ"

مکتوب : "یہ دن شدنی تھا، ہو گیا۔ والد کی جو شفقت اولاد پر ہوتی ہے وہ معلوم مگر والد مرحوم کی میرے ساتھ کچھ ایسی خصوصیت تھی کہ ان کی شفقت مجھ پر والدہ کی طرح تھی، ہر وقت ان کی خدمت میں رہنے کا عادی تھا۔ طبیعت بے چین ہے۔"

جواب : "ہونا چاہئے۔"

مکتوب : "مگر الحمد للہ صبر کرتا ہوں"

جواب : "وفقکم اللہ"

مکتوب : "لیکن والد مرحوم کی طرف سے اس کی بے چینی ہے کہ دیکھئے ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے۔"

جواب : "یہ بے چینی تو ان کے اور آپ کے حق میں رحمت ہے ورنہ دعاء مغفرت وایصال ثواب کا اہتمام کیسے ہوتا۔ جب اہتمام نہ ہوتا تو اس اہتمام کا ثواب کیسے ملتا؟"

---

[۱] پیچھے "مکاتیب حکیم الامت" کے بیان میں عرض کیا جا چکا ہے کہ حکیم الامتؒ کے پاس جو خط جاتا تھا، اس کے ہر حصہ کا جواب وہ اسی خط کے سامنے خالی کالم میں لکھ کر واپس فرما دیا کرتے تھے۔ یہاں لفظ "مکتوب" کے سامنے والد صاحب کی اور لفظ "جواب" کے سامنے حکیم الامتؒ کی عبارت نقل کی جا رہی ہے۔

مکتوب : ''الحمد للہ ظاہری حالات نہایت امید افزا ہیں کہ خالص ذکر اللہ پر خاتمہ ہوا''

جواب : ''سبحان اللہ''

مکتوب : ''صبح کی نماز کے لئے وضو کو بٹھانے کے لئے فرمایا۔ احقر نے بٹھایا تو طاقت نہ تھی نزع کی کیفیت طاری ہو گئی' لٹا دیا گیا' پھر کچھ دیر کے لئے ہوش سا آگیا' مگر ناتمام اس حالت میں توبہ استغفار کرتے رہے' پھر بالکل آخری کلام ''اللہ اللہ'' تھا کہ ختم ہو گئے۔''

جواب : ''انشاء اللہ تعالیٰ امید قریب یقین ہونا چاہئے کہ فضل و رحمت ہو گا۔''

مکتوب : ''حضرت سے بصد نیاز التجا ہے کہ والد مرحوم کی مغفرت اور معاملۂ رحمت کے لئے خاص طور پر دعا فرمادیں۔''

جواب : ''دعا کی بھی ہے اور کروں گا بھی۔ ان کا تعلق میرے ساتھ من وجہ آپ سے بھی زیادہ ہے[1]۔''

مکتوب : میرا قلب زیادہ تر اس طرف لگا ہوا ہے کہ کسی طرح حق تعالیٰ اس سے اطمینان فرمادیں۔'' : **جواب** : ''یہ بھی ہو رہے گا' باقی اس (اطمینان) میں جتنی دیر ہو گی وہ بھی رحمت ہے۔ کما سبق۔''

مکتوب : ''حق تعالیٰ حضرت والا کے سایہ کو عافیت و خیر کے ساتھ سلامت رکھے کہ میں بالکل اب بھی ایسا ہی اپنے کو پاتا ہوں جیسے والد کے زیر سایہ۔''

جواب : ''مجھ کو بھی کچھ تعلق بڑھ گیا۔''

آپ پر اس حادثہ کے اثرات

جب احقر کے دادا جان کا انتقال ہوا تو والد صاحبؒ کی عمر کا اکتالیسواں سال چل رہا تھا صحت پہلے ہی ٹھیک نہ تھی' حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں نو عمری ہی سے طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا رہا' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ پر بچپن کے بعد' جوانی کی بجائے بڑھاپا آگیا تھا۔'' ہجوم افکار مسلسل علمی و جسمانی محنت اور اس پر حاسدوں کی ریشہ دوانیاں مستزاد تھیں' قلیل آمدنی اور نو افراد کا کنبہ پہلے ہی تھا' اب والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد

---

[1] دادا جان مرحوم' حضرت حکیم الامتؒ کے رفیق درس تھے (رفیع)

اپنی بیوہ والدہ، بڑی بیوہ بہن اور ان کے سات بچوں کی کفالت کی ذمہ داریاں بھی آپ پر آگئیں، کل اٹھارہ افراد کی مکمل کفالت آپ کو تنہا کرنی تھی۔ آپ کا کوئی بھائی نہ تھا۔ احقر تو دادا جان کی وفات کے تین ماہ بعد پیدا ہوا، احقر کے سب سے بڑے بھائی اور بہنیں بھی اس وقت چھوٹے تھے۔ غرض عالم اسباب میں کوئی نہ تھا جو ان ذمہ داریوں اور پریشانیوں میں ہاتھ بٹا سکے۔

ادھر علمی مشاغل کا وہی حال تھا کہ دارالعلوم میں درجہ علیا کی کتابیں آپ کے زیر تدریس تھیں جن کی محنت و مشقت کا اندازہ اس درجہ کے مدرسین ہی کر سکتے ہیں، یہی کام اتنی محنت کا ہے کہ اس کے ساتھ کسی مستقل مشغلہ کی گنجائش نہیں رہتی مگر آپ کے مستقل مشاغل میں تصنیفات کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ فتاویٰ کا کام بھی ساتھ تھا، ماہنامہ "البلاغ" جس کے مالک و مدیر اور ناشر بھی آپ تھے اس کے بیشتر مضامین بھی آپ ہی تحریر فرماتے اور جملہ انتظام اور کاروبار خود ہی انجام دیتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک تجارتی کتب خانہ "دارالاشاعت" جو آپ کی ملکیت تھا وہ بھی آپ ہی کے زیر انتظام تھا، کتابوں کی طباعت و اشاعت، خرید و فروخت اور ترسیل ڈاک وغیرہ کا سب کام آپ کو خود ہی کرنا پڑتا تھا کبھی کبھی جزوی طور پر کوئی ملازم بھی رکھ لیا جاتا تھا۔

ان حالات میں والد کا سایہ سر سے اٹھ جانا بہت کڑی آزمائش تھی۔ چنانچہ حضرت والد صاحب سخت بیمار ہو گئے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ "میں اس زمانہ میں یوں محسوس کرتا تھا کہ والد صاحبؒ کے غم اور اپنی بیماریوں سے جانبر نہ ہو سکوں گا۔"

ان حالات کو سامنے رکھ کر وہ دردناک اور سبق آموز مرثیہ دیکھا جائے جو آپ نے شفیق والد کی وفات پر کہا ہے تو کئی اشعار کی معنویت جب ہی سمجھ میں آئے گی۔

آپ کے منظوم تاثرات اپنے والد ماجدؒ کی وفات پر

یارب یہ کیا فضا ہے یہ کیسا سماں ہے آج ۔۔۔ مشغولِ گریہ صبح سے کیوں آسماں ہے آج
کون اٹھ رہا ہے آج جہاں سے کہ یک، بیک ۔۔۔ تیرہ مری نگہ میں زمین و زماں ہے آج
کیوں رو رہا ہے آج ہر ایک خورد اور بزرگ ۔۔۔ تھمتا کسی طرح نہیں اشک رواں ہے آج

اسلاف کے چمن کی رہی تھی جو یادگار
واحسرتا وہ پھول بھی وقفِ خزاں ہے آج

یعقوبؔ اور رفیعؔ و رشیدؔ، ہمام کا
یہ آخری نشان بھی لو بے نشاں ہے آج

وہ حضرت رشیدؔ کا ایک زندہ تذکرہ
وہ کل سلف کی یاد کہاں گلفشاں ہے آج

بالیں پہ آج حضرت یاسینؔ کے کیوں عزیز
یٰسین پڑھ رہے ہیں یہ کیسا سماں ہے آج

وہ والد شفیق وہ استاذ مہرباں
وہ مرشد طریق عزیزو کہاں ہے آج

یارب کہاں وہ ذکر و مناجات صبح دم
وہ گریۂ سحر ہے نہ آہ و فغاں ہے آج

کیوں آج ذکر نیم شبی کی صدا نہیں
کیوں آہ وقت صبح بھی خوابِ گراں ہے آج

وہ صبحدم نماز کو اٹھو نماز کو[۱]
کہہ کر جگانے والا الٰہی کہاں ہے آج

کیوں آج پوچھتا نہیں کوئی شفیع کو
کس حال میں ہے کیوں نہیں آیا کہاں ہے آج

کل تک اداس دیکھ نہ سکتے تھے جس کو آپ
وہ وقف رنج و نالۂ درد و فغاں ہے آج

دنیا بھی ایک تماشہ عبرت ہے غافلو
باقی نہ کل رہے گا جو دور زماں ہے آج

اس گھر کا تجھ سے پہلے کوئی اور تھا مکیں
گہوارہ عشرتوں کا جو تیرا مکاں ہے آج

جانا ہے سب کو ایک ہی منزل پہ ایک دن
ہاں اتنی بات ہے کہ فلاں کل، فلاں ہے آج

عالم میں جن کی شان جلالت کی دھوم تھی
وہ قصر قیصری ہے نہ تخت کیاں ہے آج

اجڑے ہوئے دیار میں اور مقبروں میں بھی
ان کا مٹا ہوا سا کہیں کچھ نشاں ہے آج

دہلی و آگرہ کے وہ ایوان اور محل
بس حسرتوں کی درد بھری داستاں ہے آج

دربار عام و خاص ہے پامال خاص و عام
وہ شوکت و جلال و حشمت کہاں ہے آج

کل گونجتے تھے جن کی صداؤں سے آسماں
وہ قصر خاص دیکھ کہ "ہو" کا مکاں ہے آج

بیدار مرکے ہوتے ہیں سچ ہے کسی کا قول
اور زندگی مرادف خواب گراں ہے آج

آنکھیں کھلی ہوئی تھیں تو حاجب تھے سیکڑوں
جب آنکھ بند کی تو عیاں ہر نہاں ہے آج

کھو آج کو نہ بہر خدا کل کی فکر میں
غافل سمجھ لے اب بھی کہ تیرا جہاں ہے آج

۱؎ دادا جان رحمتہ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ نماز فجر کو جاتے ہوئے، راستہ میں آواز لگاتے جاتے تھے کہ "اٹھو نماز کو، اٹھو نماز کو" (رفیع)

امراض کا ہجوم اور زندگی سے مایوسی

اس زمانہ میں آپ پر جو کیفیت گزر رہی تھی اس کی کچھ تفصیل آپ کے مندرجہ ذیل خط سے واضح ہوتی ہے جو اس حادثہ کے تقریباً دو ماہ بعد لکھا گیا ہے۔

مکتوب بنام حکیم الامت رحؒ

مؤرخہ......۵ ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ

مکتوب : ''ناکارہ خادم تقریباً ایک ماہ سے بیمار ہے، رخصت لے کر گھر پڑا ہوا ہے۔ آج آخری رخصت بھی ختم ہوگئی اور امراض میں دو تین دن تک افاقہ رہنے کے بعد پرسوں شام سے داڑھ میں شدید درد ہوا، جس نے رہی سہی روح تحلیل کردی، ساتھ ہی بخار میں شدت ہوگئی، کل شام تک ہوش نہ لینے دیا۔ اب الحمد للہ اس کو سکون ہے مگر ضعف اس قدر ہوگیا کہ نشست و برخاست مشکل ہوگئی۔ اب کام کرنے کی تو قدرت نہیں اور مدرسہ سے جس قدر استحقاق رخصت بلا وضع تنخواہ تھا وہ پورا ہوچکا، ضروریات متعلقہ تنخواہ میں بھی پوری نہیں ہوتیں، وضع تنخواہ کے ساتھ کیسے گذر ہو؟ ان پریشانیوں نے اور زیادہ مضمحل کردیا، ناچار ایک ہفتہ کی رخصت اور لی ہے۔

جواب : ''اللہ کرے اور رخصت نہ لینا پڑے، اس رخصت میں طبیعت میں صحت اور کافی قوت عطا ہوجائے۔''

مکتوب : ''میرے قویٰ تقریباً ساقط ہوتے جارہے ہیں، حالت روز بروز گرتی جاتی ہے''

جواب : یہ اوہام ہیں انشاء اللہ تعالیٰ صحت کے ساتھ ہی یہ وہم غلط ثابت ہوگا۔''

مکتوب : ''اس وقت سب سے بڑی پریشانی تو یہ ہے کہ سراسر گناہوں میں غرق ہوں اعمال کی تو کبھی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ قلب کی حالت بھی جو کبھی پہلے محسوس ہوتی تھی، اب اس میں بھی بہت تکدّر معلوم ہوتا ہے، ضعف کے ساتھ کسل بھی مل گیا ہے کہ جس قدر عمل کی قوت ہے وہ بھی پورا نہیں ہوتا۔''

جواب : "کیا ان فوائت کا کوئی بدل نہیں؟ یہی پریشانی اور شکستگی بدل اور نعم البدل ہے' بالکل اس کا یقین رکھیں۔"

مکتوب : "ادھر سب بچے چھوٹے چھوٹے ہیں' ان کا خیال بار بار آتا ہے۔"

جواب : "یہ بھی ایک عمل فاضل[1] ہے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خود ازواج مطہرات سے فرمایا کہ اپنے بعد مجھ کو تمہاری فکر ہے۔"

مکتوب : "کبھی کبھی اپنے نفس کو ملامت کرتا ہوں کہ اس حالت میں ایسے خیالات نہیں چاہئے مگر یہ خیالات پیچھا نہیں چھوڑتے۔"

جواب : "عبادت کا پیچھا نہ چھوڑنا تو رحمت ہے' جب طاعت ہے تو کیا اس کو اہتمام آخرت کی فرد نہ کہیں گے؟"

مکتوب : "افسوس ہوتا ہے کہ ساری عمر تو دنیا کے جھگڑوں میں گزار دی' اب یہ وقت جو عمر کا آخری حصہ معلوم ہوتا ہے' یہ بھی انہی جھگڑوں میں گزرتا ہے' آخرت کا اہتمام جتنا ہونا چاہئے اس کا کوئی حصہ بھی نہیں۔ اس وقت بجز حضرت والا کی دعا و ہمت کے اس غریق کے لئے کوئی سہارا نہیں ' اس لئے درخواست ہے کہ اس ناکارہ و نالائق خادم کی دستگیری فرمادیں۔"

جواب : "دل سے دعا ہے اور تنبیہہ بالا بھی دستگیری ہے۔"

مکتوب : "معمولات تو کبھی کچھ تھے ہی نہیں بیماری میں رہے سہے بھی ختم ہو گئے' ایسی حالت میں کوئی مختصر سہل ذکر کی تلقین فرمائی جاوے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کا التزام کرلوں گا۔"

جواب : "لا الٰہ الا اللہ" لسان سے یا خیال سے اور کبھی استغفار۔"

مکتوب : "تمنا ہے کہ ایک مرتبہ پھر حضرت کی زیارت نصیب ہو جائے۔"

جواب : "ایک کیا معنی؟ ہاں اگر "ایک" اعتباری ہو تو متعدد بھی واحد میں داخل ہے۔"

مکتوب : "اس ہفتہ میں اگر کچھ بھی اطمینان نصیب ہوا تو حاضری کا قصد ہے۔"

---

[1] یعنی نفضیلت والا عمل

جواب : ""بشرطیکہ سہولت سے تحمل ہو اور کوئی ساتھ ہو، اگر سیّدؐ آسکیں تو ان کا کرایہ میں پیش کردوں گا۔""

مکتوب : ""مرض بظاہر کوئی ایسا شدید نہیں ہے جس کو دیکھ کر طبیب ناامید ہو۔""

جواب : ""بس معلوم ہوا کہ وہم ہے۔""

مکتوب : ""مگر ضعف و اضمحلال اس قدر بڑھتا جا رہا ہے کہ یہی ایک مستقل مرض ہے۔""

جواب : ""صحیح ہے مگر قلیل العمر۔""

مکتوب : ""حضرت میاں صاحب مدظلہم نے اپنے قاعدہ کے موافق میری حالت کو دیکھا تو فرمایا کہ سحر کے آثار بالکل نمایاں ہیں اور تمام اعضاء بدن میں اس کا اثر ہو چکا ہے۔ اس وقت زیادہ اہتمام سے ان کا علاج کر رہا ہوں، ڈیڑھ ماہ تک مختلف طبیبوں کا اہتمام سے علاج کرتا رہا، ذرہ برابر فائدہ محسوس نہ ہوا۔ حضرت والا بھی اگر کوئی تعویذ دفع سحر کیلئے عطا فرمادیں تو انشاءاللہ تعالیٰ باعث برکات عظیمہ ہوگا۔""

جواب : ""ملفوف ہے 'پاس رکھئے' اور بعد نماز فجر اگر کوئی محب چینی کی تشتری پر سورہ فاتحہ اور یہ دعا لکھ کر پلا دیا کرے تو زیادہ بہتر ہے۔

يَا حَيُّ حِيْنَ لَا حَيَّ فِيْ دَيْمُوْمَةِ مُلْكِهٖ وَبَقَائِهٖ يَا حَيُّ

منصب افتاء پر دوبارہ تقرر

دارالافتاء سے تدریس میں منتقلی کو تقریباً ساڑھے چار سال گزر چکے تھے۔ اس عرصہ میں دو اکابر علماء[۲] یکے بعد دیگرے اس منصب پر فائز کئے گئے۔ بالآخر ۲۵ صفر ۱۳۵۹ھ کو دوبارہ آپ ہی کو ""صدر مفتی دارالعلوم"" کے منصب جلیل پر فائز کیا گیا[۳]۔ اور تقریباً سوا تین سال

---

[۱] حضرت والد صاحبؒ کے بھانجے مولانا سید حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق استاذ حدیث و تفسیر دارالعلوم دیوبند جو اس وقت کم عمر تھے اور یتیم ہونے کے باعث والد صاحبؒ کے زیر تربیت تھے (رفیع)

[۲] تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۱۰۰

[۳] مراسلہ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم مؤرخہ ۲۵ صفر ۱۳۵۹ھ مندرجہ رجسٹر احکامات دارالافتاء نمبرا یہ اصل مراسلہ احقر کے پاس محفوظ ہے۔ (رفیع)

بعد ۱۶ ربیع الاول ۶۲ھ کو جب آپ دارالعلوم دیوبند کی ملازمت سے مستعفی ہوئے اس وقت تک اسی منصب پر فائز رہے، اس مدت میں دارالافتاء سے ۲۶۸۷۷ فتاویٰ جاری کئے گئے۔[1]

فتویٰ کے معاملہ مین جس احتیاط کے آپ ہمیشہ عادی رہے اس کے پیش نظر اس مرتبہ آپ نے یہ ذمہ داری دو شرطوں کے ساتھ قبول فرمائی تھی۔

۱۔۔۔ ایک یہ کہ جن مسائل میں اپنے غور و فکر کے بعد مجھے شرح صدر نہ ہو ان کو مشورہ کیلئے دارالعلوم کی مجلس علمی میں رکھا جائے۔

۲۔۔۔ دوسری یہ کہ مندرجہ ذیل قسم کے فتاویٰ کا جواب میری شخصی تحقیق یا رائے پر نہ ہو بلکہ دارالعلوم کے مشورہ سے دیا جائے۔

(الف) وہ فتاویٰ جو علماء محققین نے اپنے باہمی اختلافات کی وجہ سے دارالافتاء میں محاکمہ کے لیے بھیجے ہوں۔

(ب) وہ فتاویٰ جن کا تعلق عامہ اہل اسلام سے یا کسی ملک و قوم سے ہو۔

(ج) وہ فتاویٰ جن کا تعلق سیاسیات حاضرہ سے ہو۔

ان دونوں شرطوں پر کچھ عرصہ تک عمل بھی ہوا۔[2] لیکن اکابر علماء دیوبند کو آپ کے فتاویٰ پر اتنا اعتماد تھا کہ حضرت والد صاحب کے بار بار تقاضوں کے باوجود اس پابندی کی ضرورت نہ سمجھی گئی اور ہر قسم کے فتاویٰ میں آپ ہی کی تحقیق کو کافی سمجھا گیا۔ مگر آپ نے شدت احتیاط کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا ایسے اہم فتاویٰ میں زندگی بھر یہ معمول رہا کہ جب تک آپ کے بزرگ رہے ان سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔

تجارتی کتب خانہ

۱۳۴۲ھ میں جب آپ درجہ وسطیٰ کی کتابیں پڑھاتے ہوں گے آپ نے دینی کتابوں کی ایک چھوٹی سی تجارت اپنے استاذ مہربان عالم ربانی حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحب کی شرکت میں شروع کی تھی۔ اس کا اصل محرک یہ تھا کہ کتب بینی کا شوق بہت تھا مگر

---

۱ تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۱۰۰

۲ تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۱۰۰

عیال کی کثرت اور تنخواہ کی قلت کے باعث کتابیں خریدنے کی گنجائش نہ تھی اس تجارت کو آپ نے کتابوں کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ حضرت میاں صاحب ممدوح کو ایک چھوٹا سا کمرہ دارالعلوم میں آرام اور مطالعہ کتب کیلئے ملا ہوا تھا۔ درس سے فارغ اوقات میں جو طلبہ اپنے شوق سے کوئی کتاب پڑھنا چاہتے اسی میں دونوں حضرات ان کو پڑھاتے تھے اور اسی میں یہ کتب خانہ بھی قائم تھا، رفتہ رفتہ اس کتب خانہ سے چھوٹے چھوٹے کتابچے بھی شائع ہونے لگے اور اسکا نام "دارالتدریس والاشاعۃ" رکھ دیا گیا۔

۱۴۱۴ روپے کا راس المال حضرت میاں صاحب موصوف نے اور ۲۱۳ روپے کا راس المال حضرت والد صاحب نے لگا کر اس مشترک کاروبار کا آغاز کیا اور کام چونکہ سب والد صاحب کے ذمہ تھا اس لئے نفع مساوی طے ہوا۔

تقریباً ۱۳۵۰ھ میں یا اس کے کچھ بعد جب کام بڑھا تو یہ کتب خانہ حضرت والد صاحب نے اپنے نئے تعمیر شدہ مکان کے مردانہ کمرے میں منتقل فرمالیا۔ پھر ۱۳۵۸ھ میں حضرت میاں صاحب نے اپنا حصہ بھی والد صاحب کے ہاتھ فروخت کر دیا[1] اور اس کتب خانہ کا نام "دارالاشاعت" رکھ دیا گیا۔

دارالاشاعت کا سب کام آپ دوپہر کے فارغ وقت میں انجام دیتے تھے۔ کتابوں کی ترتیب، بل بنانا، بنڈل باندھ کر ان پر پتے لکھ کر ڈاک سے روانہ کرنا، تجارتی خطوط، کتابوں کی کتابت وطباعت، خرید و فروخت اور حساب کتاب غرض اول سے آخر تک سب کام تقریباً اٹھارہ سال تک اکیلے ہی انجام دیتے رہے۔ تجارتی کاموں سے دہلی اور سہارنپور کا سفر بھی بکثرت پیش آتا تھا جو عموماً جمعہ یا دارالعلوم کی دیگر تعطیلات میں ہوتا تھا۔

جب کتب خانہ کا کام زیادہ بڑھا تو جزوی طور پر ایک ملازم رکھ لیا گیا۔ ادھر ۱۳۶۰ھ کے لگ بھگ جب ہمارے بھائی جان (جناب مولانا محمد زکی کیفی صاحب مرحوم) بھی کچھ بڑے ہو گئے تو اس کام میں والد صاحب کا ہاتھ بٹانے لگے۔ والد صاحب نے اس کام کی انہیں خصوصی تربیت دی حتیٰ کہ ہجرت پاکستان سے تقریباً تین سال پہلے تو بھائی جان نے یہ کاروبار

---

[1] شرکت کی یہ تفصیلات اس شراکت نامہ سے ماخوذ ہیں جو اس وقت لکھا گیا تھا۔ یہ تحریر برادر بزرگوار جناب محمد رضی صاحب کے پاس بعینہ محفوظ ہے۔

پوری طرح سنبھال کر والد صاحب کو ملک وملت کی خدمات کے لئے قریب قریب فارغ ہی کر دیا۔

اس تجارت میں جو والد صاحب نے صرف ۲۱۳ روپے سے شروع کی تھی، اللہ تعالیٰ نے جو حیرتناک برکتیں عطا فرمائیں ان کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل تفصیل سے ہوگا۔

۱۔ ماہنامہ "المفتی" جو آٹھ سال تک دینی حلقوں سے خراج تحسین لیتا رہا وہ اسی کتب خانہ سے نکلتا تھا۔

۲۔ حضرت والد صاحب کا ذاتی کتب خانہ جس میں آپ نے محض اپنے مطالعہ کے لئے ہزاروں نہایت قیمتی، ضخیم اور نادر کتابیں جمع فرمائی تھیں وہ بھی اسی کتب خانہ "دارالاشاعت" کی تجارت سے حاصل ہوئیں۔ اب ان بیش بہا کتابوں سے بحمداللہ دارالعلوم کراچی کے اساتذہ اور طلبہ استفادہ کررہے ہیں۔

۳۔ حضرت والد صاحبؒ کی تقریباً تمام تصانیف اور دوسرے بزرگوں کی بھی بہت سی کتابیں اسی کتب خانہ سے شائع ہوئیں۔

۴۔ دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہونے کے بعد کوئی ذریعہ معاش سوائے اس تجارت کے نہیں تھا کئی سال تمام خانگی مصارف کا مدار بھی اسی تجارت پر رہا۔ ویسے بھی تنخواہ کافی نہ ہوتی تھی، آڑے وقت میں اسی سے مدد لی جاتی تھی۔

۵۔ والد صاحبؒ نے جنوبی افریقہ کے ایک دیرینہ دوست مولانا محمد سلیمان اسماعیل صاحب کے تعاون سے اسی کتب خانہ میں ایک خاص شعبہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی تصانیف شائع کرنے کیلئے بنام اشرف العلوم قائم فرمایا تھا۔ جو آخر حیات میں دارالعلوم کراچی کے نام وقف کردیا۔ اب وہ دارالعلوم کراچی کا ایک بڑا نشریاتی شعبہ بن کر "مکتبہ دارالعلوم" کے نام سے مصروف کار ہے اور خود کفیل ہے۔

۶۔ ہجرت پاکستان کے بعد جب حضرت والد صاحبؒ نے کتب خانہ دارالاشاعت کو ہم پانچوں بھائیوں میں تقسیم فرمایا تو اس سے تین بڑے بڑے تجارتی کتب خانے وجود میں آئے۔ (۱) لاہور میں "ادارہ اسلامیات" جو بھائی جان کے حصہ میں آیا (۲) کراچی میں "دارالاشاعت" جو برادر بزرگوار جناب محمد رضی صاحب عثمانی کے حصہ میں آیا (۳) "ادارۃ المعارف" کراچی (کورنگی) جو برادر عزیز مولانا محمد تقی صاحب عثمانی اور

احقر کو مشترک طور پر ملا۔ برادر بزرگوار جناب محمد ولی رازی صاحب نے اپنا حصہ کاروبار میں نہیں لگایا ورنہ ایک کتب خانہ ان کا ہوتا۔

اس وقت یہ سب کتب خانے بحمد اللہ ملک کے مشہور دینی کتب خانوں میں شمار ہوتے ہیں اور دینی کتابوں کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ اردو' عربی' فارسی کی ہزار سے زیادہ کتابیں شائع کر چکے ہیں۔

اس برکت کا راز

حضرت والد صاحب کے ہر کام میں آئے دن اسی قسم کی برکات کا مشاہدہ ہوتا تھا۔ آپ کی اصل دولت قناعت واستغناء تھی۔ اہل خانہ رشتہ داروں اور حاجت مندوں پر خرچ کرنے میں بہت فیاض تھے لیکن آپ کا کوئی پیسہ یا کوئی وقت فضول خرچ ہوتے ہم نے نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بہت قدر فرماتے ہر چیز نہایت سلیقہ اور انتظام سے استعمال فرماتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں جن کی طرف عام طور سے دھیان نہیں جاتا ان کا بھی آپ کے ہاں ایک مصرف مقرر تھا۔ کتب خانہ میں باہر سے کتابوں کے بنڈل اور پیکٹ بہت آتے تھے۔ آپ کی عادت تھی کہ ان کی ستلی کھول کر گولے کی شکل میں محفوظ فرمالیتے تاکہ دوبارہ استعمال میں آسکے۔

ایک لطیفہ' ایک سبق

بھائی جان کے لڑکپن کا یہ واقعہ حضرت والد صاحبؒ نے کئی بار سنایا کہ "میں نے ایک بنڈل میاں زکی کو کھولنے کے لئے دیا' انہوں نے قینچی سے ستلی جگہ جگہ سے کاٹ کر بنڈل کھول دیا' میں نے ایک طمانچہ رسید کیا کہ یہ کیا طریقہ ہے تم نے ساری ستلی ضائع کر دی اور آئندہ کے لئے طریقہ بتایا"۔۔ بھائی جان اپنا یہ واقعہ بڑے مزے لے لے کر ہمیں سنایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس طمانچہ نے مجھے پوری تجارتی زندگی میں فائدہ پہنچایا' خاص طور سے ستلی تو مجھے اتنے بڑے کاروبار میں کبھی خریدنی ہی نہیں پڑی۔

سیاسیات میں فکری و عملی حصہ

آپ طبعاً ہنگاموں، سیاسی جلسوں اور جلوسوں سے الگ رہنا پسند فرماتے تھے، لیکن جب بھی اسلام اور مسلمانوں کی کسی اہم دینی ضرورت نے سیاست میں عملی حصہ لینے کا تقاضا کیا۔ آپ اس میں بھی سرگرمی سے بقدر ضرورت شریک ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم کے اواخر میں جب مجاہدین بلقان ہر طرف سے کفروالحاد کے نرغہ میں تھے، اس کی نزاکت اکابر علمائے دیوبند نے پوری شدت سے محسوس کی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نے اپنے تلامذہ اور مریدین کے ذریعہ مجاہدین بلقان کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم چلائی۔ یہ وقت حضرت مفتی صاحب مدظلہم کی نوعمری اور طالب علمی کا تھا آپ نے اس پر خلوص مہم میں نہایت سرگرمی سے رضاکارانہ حصہ لیا۔ سخت بارش کے زمانہ میں بھی پیدل گاؤں گاؤں پھر کر چندہ جمع فرمایا۔

قائد اعظم سے پہلی ملاقات[1]

زعمائے مسلم لیگ میں دین سے عام بے رغبتی اور مغربیت کے رجحان سے ہر مسلمان کے دل میں خلجان ہوتا تھا، علمائے کرام کی خواہش یہ تھی کہ زعمائے لیگ اسلامی شعائر کی پابندی اور تقویٰ و طہارت کے اوصاف سے بھی آراستہ ہوں، اکابر علماء کی جانب سے اس سلسلہ میں بھی ہر ممکن سعی کی گئی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ جو ان علماء کرام کے سرپرست تھے، آپ نے قائد اعظم اور دوسرے زعماء مسلم لیگ کو دسمبر ۱۹۳۸ء (تقریباً ۱۳۵۷ھ) سے برابر تبلیغی خطوط اور وفود بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہر اہم دینی ضرورت کے موقع پر آپ کی طرف سے کوئی وفد یا ایلچی قائد اعظم کے پاس پہنچتا تھا ان کو حضرت سے گہری عقیدت تھی اور وہ بھی آپ کی خدمت میں نامہ و پیام بھیجتے

---

[1] قائد اعظم سے ملاقاتوں کا حال احقر نے حضرت والد صاحب ؒ سے کئی بار سنا لیکن سب تفصیلات یاد نہ تھیں، یہاں سب تفصیلات جناب منشی عبدالرحمٰن صاحب کی کتاب "تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی" سے لی گئی ہیں۔

رہتے تھے۔ انہوں نے حضرت کے بھیجے ہوئے ایک وفد ہی کی حکیمانہ تبلیغ پر یہ کہا تھا کہ :

"میں گنہ گار ہوں، خطاوار ہوں آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں، میرا فرض ہے کہ اس کو سنوں، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھا کروں گا۔"[1]

والد صاحبؒ نے قائد اعظم سے دو مرتبہ ملاقات فرمائی۔ دوسری ملاقات کا بیان تو آگے آئے گا جو جون ۱۹۴۷ء میں ہوئی تھی۔

پہلی ملاقات کی تفصیل یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۳۹ء کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح کی بعض تقاریر پڑھ کر حضرت تھانویؒ نے محسوس فرمایا کہ قائد اعظم سیاست کو دین سے الگ سمجھتے ہیں۔ اس نظریہ کی اصلاح کے لیے علماء کا ایک وفد قائد اعظم سے ملنے کے لیے دہلی روانہ فرمایا جو حضرت والد صاحبؒ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانویؒ مہتمم خانقاہ تھانہ بھون پر مشتمل تھا۔ تین حضرات کا یہ وفد ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو دہلی پہنچا۔ شام کے سات بجے کا وقت ملاقات کے لئے طے ہوا۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کا بیان ہے کہ :

وفد نے قائد اعظم سے کہا کہ مسلمان کسی تحریک میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس تحریک کو شریعت کے مطابق نہ چلائیں، اس تحریک کے چلانے والے خود کو احکام اسلام کا نمونہ نہ بنائیں اور ان کے پیرو شعائر اسلام کی پابندی نہ کریں کیونکہ جب یہ سب خود کو احکام دین کا پابند بنالیں گے تو اس کی برکت سے نصرت و کامیابی خود بخود ان کے قدم چومے گی اور انشاء اللہ بہت جلد کامیابی نصیب ہو گی۔ وفد نے مزید کہا کہ مسلمانوں کی سیاست کبھی مذہب سے الگ نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے قائد مسجدوں کے امام بھی تھے اور میدان کے جرنیل بھی، خلفائے راشدینؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ وغیرہ سب مذہب و سیاست کے جامع تھے۔ قائد اعظم نے فرمایا "میرا تو خیال یہ ہے کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہیے" وفد نے کہا کہ پھر "اس طرح کامیابی کی توقع نہیں۔"

---

[1] ان سب واقعات کی باحوالہ مفصل روئداد کے لئے "تعمیر پاکستان اور علماء ربانی" کا مطالعہ فرمایا جائے۔

غرض اس موضوع اور بعض دوسرے اہم دینی مسائل پر تقریباً اڑھائی گھنٹہ گفتگو ہوتی رہی۔ قائداعظم کے اس اعتراف پر یہ مجلس ختم ہوئی کہ :

"دنیا کے کسی مذہب میں سیاست مذہب سے الگ ہو یا نہ ہو میری سمجھ میں اب خوب آگیا کہ اسلام میں سیاست مذہب سے الگ نہیں بلکہ مذہب کے تابع ہے۔" (روئداد صفحہ ۷) (ماخوذ از تعمیر پاکستان و علمائے ربانی ۸۱ تا ۸۲)

قیام پاکستان کی تحریک

جس زمانہ میں حضرت والد صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی اور تدریس کے منصب جلیل پر فائز تھے، اسی زمانہ میں مسلم لیگ نے کانگریس کے علی الرغم مسلمانان برصغیر کے لئے ایک آزاد و خود مختار وطن پاکستان کا مطالبہ کیا۔ اس موقع پر اکابر علماء دیوبند اپنی دیانت دارانہ رائے کی بناء پر دو مختلف گروہوں میں منقسم ہوگئے۔ ایک گروہ جمعیۃ علمائے ہند کے سرکردہ زعماء کا تھا جو کانگریس کے ہم آواز ہو کر متحدہ قومیت کا حامی اور تقسیم ہند کے خلاف......... اور مطالبہ پاکستان کو مسلمانوں کے لئے مضر سمجھتا تھا۔

دوسرا گروہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت والد صاحبؒ وغیرہما پر مشتمل تھا، جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی رائے کے مطابق مسلمانان ہند کو کافروں کی غلامی اور استبداد سے نجات دلانے کیلئے قیام پاکستان کو وقت کی سب سے بڑی ضرورت سمجھتا تھا اور جس طرح کا اشتراک اب بعض مسلم جماعتیں کانگریس کے ساتھ کرنے لگی تھیں اسے درست نہ سمجھتا تھا۔

شروع میں یہ اختلاف آپس کے تبادلۂ خیالات، علمی مباحثوں اور دارالعلوم کی چہار دیواری تک محدود رہا۔ لیکن پاکستان کے لئے ہونے والا الیکشن جوں جوں قریب آرہا تھا مخالفین کا یہ پروپیگنڈہ زور پکڑتا جارہا تھا کہ مسلم لیگ بے دین امراء کی نمائندہ ہے، اسے علماء کی تائید حاصل نہیں۔" ادھر ارباب مسلم لیگ بھی محسوس کر رہے تھے کہ جب تک ہر محاذ پر علماء کرام بھرپور تعاون نہ فرمائیں پاکستان کا قیام ممکن نہیں۔

تحریک پاکستان کی خاطر دارالعلوم دیوبند سے استعفا

اب وقت آگیا تھا کہ مسئلہ کا ہر پہلو کھول کر عوام کے سامنے لایا جائے اور پاکستان کا مطالبہ سیاسی و شرعی حیثیت سے جیسا کہ حق بجانب ' بروقت اور ضروری ہے 'اس کا صرف اظہار ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اس کی آواز پوری قوت سے پہنچائی جائے۔ دارالعلوم دیوبند میں رہتے ہوئے اس اختلاف کا مسلسل اظہار نظم دارالعلوم کے لئے مناسب نہ تھا۔ اس لئے حضرت تھانویؒ کے مشورہ سے دارالعلوم سے علیحدگی کا فیصلہ فرمالیا۔

یہ فیصلہ ان حضرات کے لئے جتنا صبر آزما تھا' اس کا اندازہ ہر ایک کو نہیں ہو سکتا' ان حضرات نے اپنے بچپن ' جوانی اور کہولت کے شب و روز اسی کی چہار دیواری میں گذارے تھے' زندگی کی ولولہ انگیز توانائیاں اسی کی تعمیر میں صرف کی تھیں' ان حضرات کے لئے یہ صرف ایک درس گاہ نہیں بلکہ دنیا و آخرت کی امیدوں کا مرکز تھا' دارالعلوم ان کا وطن بھی تھا' آغوش مادر بھی۔ لیکن ملک و ملت کی خاطر اب اس آغوش مادر سے ضابطہ کا تعلق باقی رکھنا ممکن نہ تھا۔ بالآخر ۱۶ ربیع الاول[1] ۱۳۶۲ھ کا وہ دن آپہنچا' جب شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کی معیت میں حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ' حضرت والد صاحبؒ' آپ کے برادر عم زاد حضرت مولانا ظہور احمد صاحبؒ' جناب خلیفہ محمد عاقل صاحبؒ اور دیگر دو علمائے کرام جن کے اسماء گرامی اس وقت یاد نہیں' دارالعلوم کی خدمات سے مستعفی ہو گئے۔ ان میں سے ایک غالباً مولانا محمد مسلم صاحب عثمانیؒ تھے۔

استعفا کے بعد آپ تھانہ بھون حاضر ہوئے تو حضرت تھانویؒ نے دیکھتے ہی دیوان حماسہ کا ایک مصرعہ کچھ تصرف کر کے اس طرح پڑھا۔

أَضَاعُوكَ وَ أَيَّ فَتًى أَضَاعُوا

(لوگوں نے تجھے اپنے ہاتھ سے کھو دیا اور وہ کیسے عظیم انسان کو کھو بیٹھے)

۱۳۳۵ھ سے ۱۳۶۲ھ تک تدریس و افتاء کی ۲۷ سالہ خدمات کے بعد جب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوئے تو مشاہرہ ۶۵ روپے تھا۔[2]

---

[1] مکاتیب حکیم الامت ص ۲۳۳ (مخطوطہ) [2] مکاتیب حکیم الامت ص ۲۳۴

مسلم لیگ کی تحریک جو دو قومی نظریہ پر مبنی تھی، حکیم الامت حضرت تھانویؒ اس کی حمایت ۱۳۵۶ھ (تقریباً ۱۹۳۷ء) ہی سے اپنی تحریروں کے ذریعہ فرما رہے تھے[1]۔ تحریک پاکستان میں والد صاحبؒ کا حصہ بھی شروع میں محض علمی خدمات تک محدود رہا، دارالعلوم سے استعفاء کے بعد آپ نے پوری طرح کھل کر اس موضوع پر لکھنا شروع کیا اور کچھ عرصہ بعد تو قیام پاکستان کی جدوجہد ہی شب روز کا مشغلہ بن گئی تھی جسکی تفصیل ذرا آگے بیان ہوگی۔

تھانہ بھون میں تصنیف وافتاء

یہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی حیات کا آخری دور تھا۔ مرض وفات شروع ہو چکا تھا اور ضعف روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ تصنیف اور افتاء کا جو کام آپ کی ذات گرامی سے وابستہ تھا، اسے سنبھالنے کے لئے آپ نے والد صاحبؒ کو تھانہ بھون بلالیا، مرشد کی خواہش کے مطابق مستقل قیام کے لئے والد صاحب ۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۲ھ کو تھانہ بھون پہنچے اور ۱۷ جمادی الاولیٰ سے یہ دونوں خدمات شروع کردیں، صبح ساڑھے پانچ بجے سے ساڑھے نو بجے تک چار گھنٹے تصنیف کے کام میں مشغولیت رہتی، اس کے بعد اگر حکیم الامتؒ کی مجلس ہوتی تو اس میں شریک ہوتے اور بعد ظہر بھی حضرت ہی کی مجلس میں حاضری رہتی۔ دوپہر اور رات کا وقت فتاویٰ کے کام میں صرف ہوتا تھا[2]۔

احکام القرآن کی تصنیف

تصنیف میں اس وقت عظیم ترین کام احکام القرآن (عربی) کا پیش نظر تھا جو حکیم الامت اپنے ضعف وعلالت کے باعث خود انجام نہ دے سکے تو کافی عرصہ قبل یہ کام چار علماء کرام پر تقسیم فرما دیا تھا۔ دو جلدیں خامس وسادس (سورۃ الشعراء سے سورۃ الحجرات کے ختم تک) والد صاحبؒ کو لکھنی تھیں۔
یہ کام اگرچہ والد صاحبؒ ۱۳۶۲ھ میں ہی شروع فرما چکے تھے[3] مگر اس ٹھوس علمی و تحقیقی

---

[1] حوالہ بالا ص ۱۹۷ [2] مکاتیب حکیم الامتؒ (ص ۱۶۳)

[3] مکاتیب حکیم الامتؒ ص ۱۶۳۔

کام کے لئے جس فراغتِ وقت کی ضرورت تھی وہ دار العلوم دیوبند کی ذمہ داریوں کے ساتھ ممکن نہ تھی' لہٰذا اس کام میں تسلسل برقرار نہ رہ سکا تھا۔ ماہنامہ "المفتی" کئی سال پہلے بند ہو چکا تھا اور تجارتی کتب خانہ دار الاشاعت بڑی حد تک بھائی جان نے سنبھال لیا تھا' اس سے بھی ذہن فارغ تھا۔ اس لئے اب تھانہ بھون میں پوری یکسوئی کے ساتھ آپ اس خدمت میں منہمک ہو گئے۔

مگر تجارتی کتب خانہ ابھی تک اس قابل نہ تھا کہ خانگی مصارف کا تمام تر بوجھ اس پر ڈالا جا سکے' اس لئے حکیم الامت‌ؒ والد صاحب‌ؒ کا مشاہرہ مقرر فرمانا چاہتے تھے مگر والد صاحب کی خواہش تھی کہ بلا معاوضہ خدمت انجام دیں۔ آخر کار حکیم الامت‌ؒ نے فرمایا کہ "آپ کی طرف سے تو کسی معاوضہ یا تنخواہ کی شرط نہیں مگر ہم جب کبھی کچھ دیں تو وہ لے لیا کریں"[1]۔ پونے دو ماہ تک تصنیف و فتویٰ کی ان خدمات کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری رہا۔

قضا و قدر کے فیصلے

مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا' واقعہ یہ پیش آیا کہ دیوبند میں والد صاحب نے کچھ عرصہ قبل اپنے باغ سے ملحق ایک چھوٹی سی زمین خریدی تھی' جس کا بیعانہ بھی ہو چکا تھا' ایک شخص جو اس میں جزوی طور پر شریک تھا' اس نے بھی بار بار علانیہ طور پر اس بیع کی اجازت دے دی تھی مگر اب اچانک اس نے شفعہ کا دعویٰ دائر کر دیا۔ والد صاحب‌ؒ کو حکیم الامت‌ؒ سے اجازت لے کر ۶ رجب ۶۲ ھ کو مجبوراً دیوبند آنا پڑا اور یہاں سے ۸ رجب کو حضرت‌ؒ کی مزاج پرسی کے لئے خط روانہ کیا۔ ۱۰ رجب کو حضرت ہی کے قلم کا لکھا ہوا جواب موصول ہو گیا جس میں کسی غیر معمولی تکلیف کا اظہار نہ تھا۔ کسے خبر تھی کہ یہ حضرت حکیم الامت‌ؒ کا آخری خط ثابت ہو گا۔ تاہم والد صاحب‌ؒ کی طبیعت حضرت کی طرف سے بے چین تھی اس لئے اپنا حق چھوڑ کر مدعی کا دعویٰ تسلیم کر لیا تاکہ مقدمہ ختم کر کے صلح ہو جائے اور جلد از جلد تھانہ بھون پہنچ سکیں۔ ۱۵ رجب کو ایک خط میں یہ سب تفصیل لکھ کر حضرت‌ؒ کی خدمت میں روانہ کی اور لکھا کہ ان دھندوں سے فارغ ہو کر جمعہ ۱۹ رجب کو تھانہ بھون حاضر

---

[1] حوالہ بالا ص ۲۳۷

ہو جاؤں گا مگر یہ پہلا موقع تھا کہ خط جواب کے بغیر واپس آگیا[۱]۔ قدرت بے نیاز نے فیصلہ ہی کچھ اور کر دیا تھا۔

حکیم الامتؒ کی وفات

یہ جگر خراش حادثہ مجھے بھی یاد ہے میری عمر کا اُس وقت آٹھواں سال تھا۔ بدھ ۱۳۶۲ھ کو صبح تقریباً نو دس بجے کا وقت تھا، حضرت والد صاحبؒ شاید عدالت جانے کی تیاری کر رہے تھے، بھائی جان جو کسی کام سے سہارنپور گئے ہوئے تھے، اچانک یہ المناک خبر لائے کہ رات حضرتؒ کا انتقال ہو گیا۔

سنتے ہی والد صاحبؒ کا حال ناقابل بیان ہو گیا، ابتداءً سکتہ سا ہوا، چہرے کی رنگت بدل گئی پھر بے تابانہ ٹہلتے جاتے اور "انا للہ و انا الیہ راجعون" پڑھتے جاتے تھے، استغراق کا سا عالم تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمجھ نہیں آرہا کیا کریں، دیکھتے ہی دیکھتے گھر میں ہجوم ہو گیا، پورے دیوبند میں ہلچل مچ گئی، جس کو جو سواری ملی تھانہ بھون روانہ ہو گیا، جسے کچھ نہ مل سکا بائیسکل پر دوڑ پڑا۔ ایک ایک سائیکل پر کئی کئی سوار تھے، بہت سے لوگ پیدل ہی چل پڑے۔ والد صاحبؒ بھی چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں دیوبند پر سناٹا چھا گیا، تمام مرد نماز جنازہ میں شرکت اور آخری دیدار کیلئے تھانہ بھون جا چکے تھے۔

والد صاحبؒ کو یہ قلق ہمیشہ رہا کہ عین آخر وقت میں مجھے تھانہ بھون سے دیوبند آنا پڑ گیا اور آخری لمحات میں حضرت کی نظروں کے سامنے نہ رہ سکا۔ چنانچہ مکاتیب حکیم الامتؒ میں جہاں حضرتؒ کے نام اپنا آخری خط نقل کیا ہے، اس کے حاشیہ پر یہ پورا واقعہ نقل کر کے بڑی حسرت سے یہ شعر لکھا ہے کہ :

رفتم کہ خار از پا کشم ، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دور شد

آپ کا اردو اور فارسی کلام عشق مرشد میں ڈوبا ہوا ہے، جذباتِ عقیدت نے کہیں غزل کا روپ دھارا ہے کہیں نظموں اور قطعات کا۔ یہ سب کلام "کشکول" میں چھپ چکا

---

[۱] مکاتیب حکیم الامت، سب سے آخری خط مورخہ ۵ رجب ۱۳۶۲ھ ص ۲۳۸ (مخطوطہ)

ہے۔اس حادثہ پر آپ نے ایک مرثیہ فارسی میں اور ایک اردو میں کہا ہے' اردو کا مختصر ہے۔

اس حادثہ پر آپ کے منظوم تاثرات[1]

وہ حکیم امت خیر الوریٰ قطب ہدیٰ
وہ دوا امت کے ہر بیمار کی' ناشاد کی

صدق صدیقی تھا جس میں حزم فاروقی کے ساتھ
ایک درخشاں یادگار اسلاف اور امجاد کی

مشعل راہ ھدیٰ' نور محمد کی ضیا
آہ وہ زندہ نشانی حضرت امداد کی

حضرت اشرف علی تھانوی روحی فداہ
جن سے قائم تھیں ہزاروں مسندیں ارشاد کی

ہیں سبھی اہل کمال واہل دل مصروف کار
دیکھ لو خالی پڑی ہے ہر جگہ استاد کی

کیوں نہ ہوں چشم فلک سے خون کے آنسو رواں
کیوں نہ روئے زمیں صف ماتم و فریاد کی

خستہ حالوں کے لئے اب ہے نہیں جائے پناہ
آسماں تانبے کا ہے آج اور زمین فولاد کی

وائے ناکامی کہ ہم جیسے تباہ وخستہ دل
اور چھائی ہیں گھٹائیں ہر طرف الحاد کی

---

[1] کشکول ص ۱۷۲

ناخدا گم کردہ ہے کشتی امت اے کریم
بے زبوں حالت ہمارے مجمع وافراد کی

المدد بہر حبیب خود الٰہی المدد
امت مرحوم پھر محتاج ہے امداد کی

حکیم الامتؒ کے بعد

اس حادثے کے بعد صحیح مدت تو یاد نہیں مگر اتنا یاد ہے کہ والد صاحبؒ کافی عرصہ تھانہ بھون میں مقیم رہے۔ ناچیز راقم الحروف کی عمر اسوقت سات سال سے کچھ اوپر اور برادر بزرگوار جناب محمد ولی صاحب رازی کی عمر نو سال تھی، ہماری والدہ محترمہ اور ہم دونوں بھی اس قیام میں ساتھ تھے۔ مہینوں تک ملک کے اطراف سے تعزیت کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ فتاویٰ اور احکام القرآن کی تصنیف کا جو کام حضرتؒ کے سامنے جاری تھا والد صاحبؒ نے اسے جاری رکھا۔

خانقاہ تھانہ بھون میں خدمت دین کے چار بنیادی سلسلے حضرت حکیم الامتؒ کی ذات گرامی سے وابستہ تھے۔ (۱) تصنیف و تالیف (۲) فتاویٰ (۳) اصلاح وارشاد (۴) وعظ و تذکیر...... حکیم الامتؒ کے اکابر خلفاء نے تھانہ بھون میں مشورہ کے بعد یہ طے کیا کہ والد صاحب دیوبند سے ترک سکونت کر کے مستقل قیام یہیں فرمائیں اور خانقاہ میں ان چاروں سلسلوں کو جاری رکھیں...... مگر والد صاحبؒ نے فیصلہ اپنی ضعیف والدہ پر چھوڑا جو دیوبند ہی میں تھیں۔ انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو جو ظاہر اسباب میں ان کی زندگی کا واحد سہارا تھا، اس کی اجازت نہ دی۔ بالآخر والد صاحبؒ ہم سب کو لے کر دیوبند واپس آگئے۔

تصنیف اور فتاویٰ کا کام یہاں بھی جاری رہا۔ بلکہ یہ مصروفیت تو زندگی کے آخری لمحات تک برابر چلتی رہی لیکن احکام القرآن کا کام زیادہ تیز رفتاری سے نہ چل سکا۔ کیونکہ اب ملک کے سیاسی حالات نے دینی جدوجہد کا ایک نیا میدان کھول دیا تھا جس کی طرف رہ نمائی حکیم الامت فرما چکے تھے۔ والد صاحب کی مصروفیات اب اس میدان میں بڑھ رہی تھیں، احکام القرآن کی تکمیل پاکستان آنے کے بھی بہت عرصہ بعد ۱۷ رمضان ۱۳۸۸ھ کو

ہوئی۔ بحمد اللہ اب یہ کتاب شائع بھی ہو گئی ہے۔

قیام پاکستان کے لئے سرگرم جدوجہد

کانگریسی نظریہ کی تردید اور پاکستان کی حمایت میں تصانیف

اس مسئلہ میں عام فتاویٰ اور متفرق مضامین کے علاوہ آپ نے ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۵ء میں ایک مستقل رسالہ "کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ" تصنیف فرمایا۔ جس میں اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کو نہایت تفصیل سے واضح فرمایا' اس موضوع پر یہ پہلی علمی کتاب تھی جس میں غیر مسلموں سے مسلمانوں کی موالات' مصالحت اور استعانت کی تمام صورتوں کے علیحدہ علیحدہ شرعی احکام اتنی خوبی اور تفصیل سے جمع کیے گئے' دلائل میں حضرت والد صاحبؒ نے اپنی عادت کے مطابق قرآن و سنت اور فقہی عبارات کے نہایت معتمد شواہد پیش کیے اور عقل و سیاست کے ہر پہلو سے یہ ثابت کیا کہ موجودہ حالات میں کانگریس کی حمایت سے دراصل کفر کی حمایت لازم آئے گی اور اس میں حصہ لینا قرآن و سنت کی رو سے کسی طرح جائز نہیں۔ یہ رسالہ اسی وقت بڑی تعداد میں شائع ہوا[1]۔

علاوہ ازیں اپنے مرشد حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے دس رسائل' متفرق مضامین اور ملفوظات و مکتوبات کا ایک مجموعہ مرتب کرکے کتابی شکل میں "افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ" کے نام سے شائع فرمایا۔ یہ مجموعہ بھی اس موضوع پر بہت مؤثر ثابت ہوا۔

بروقت ایک اہم فتویٰ

۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کے انتخابات تحریک پاکستان کے لئے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ سہارنپور اور مظفر نگر وغیرہ کے حلقہ انتخاب سے کانگریس کے مقابلہ میں مسلم لیگ کی جانب سے قائد ملت لیاقت علی خاں مرحوم کھڑے ہوئے جو بعد میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم بنے۔ یہاں

---

[1] یہ رسالہ اب "جواہر الفقہ" کا جزو بن کر شائع ہوا ہے۔ اس کا نیا نام "سیاست میں غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل کی شرعی حدود" ہے۔ رفیع ۱۳-۶-۹۵ھ

مسلم لیگ کی کامیابی سب ہی کو مشکل نظر آرہی تھی مگر حضرت والد صاحبؒ کے ایک فتوے نے فضا یکسر بدل دی۔ مجھے یاد ہے کہ یہ فتویٰ پوسٹروں کی شکل میں پورے حلقہ انتخاب میں چسپاں کیا گیا جس کا بڑا عنوان یہ تھا۔ "کانگریس کی حمایت کفر کی حمایت ہے۔" یہ پوسٹر احقر کے پھوپی زاد بھائی جناب مولانا حامد حسن انصاری "فاضل دارالعلوم دیوبند" سہارنپور سے دیوبند بھی لائے اور پولنگ سے ایک روز قبل راتوں رات دیوبند میں چسپاں کئے گئے۔

جناب خواجہ آشکار حسین صاحب نے جو مسلم لیگ کی ہائی کمان کی جانب سے اس حلقہ کا جائزہ لینے پر مامور تھے۔ ماہنامہ نقاد (کراچی) میں یہ واقعہ قدرے تفصیل سے تحریر کیا ہے اس کے چند اقتباسات یہ ہیں : "سب سے سخت مقابلہ خود لیاقت علی خاں کے حلقہ انتخاب میں تھا۔"

آگے فرماتے ہیں کہ : "ہم سہارنپور پہنچے' وہاں حامیان لیگ نے کہا کہ یہاں مفتی محمد شفیع کے فتوے کے بغیر کام نہ چلے گا' میں نے دیوبند جاکر موصوف کا فتویٰ بھی حاصل کیا اور سہارنپور پہنچ کر اس کی طباعت کے انتظامات کرائے۔ ۲۷ نومبر کو پولنگ ہونے والی تھی۔ ۲۴ نومبر کو لیاقت علی خاں سہارنپور پہنچے۔"

فاضل مضمون نگار آگے فرماتے ہیں :

"میں فوراً ڈاک بنگلہ پہنچا۔ لیاقت صاحب بڑے جوش سے بغل گیر ہوئے اور فتوے کی کامیابی پر مبارکباد دی۔ میں نے فوراً مفتی صاحب کا فتویٰ پیش کردیا۔ دیکھ کر اچھل پڑے پھر حالات کے متعلق استفسار کرنے لگے۔" (ماہنامہ نقاد کراچی ۱۹۵۲ء ص ۶۷)

جمعیتہ علماء اسلام کا قیام

________________ نومبر ۱۹۴۵ء "تقریباً ۶۴ھ" میں کلکتہ میں جمعیتہ علماء اسلام کی بنیاد ڈالی گئی' جس کے مقاصد میں سرفہرست یہ تھا کہ مطالبہ پاکستان کے لئے مؤثر جدوجہد کی جائے اور جو مسلمان مطالبہ پاکستان سے منحرف یا تردد کی حالت میں کھڑے ہیں انھیں قیام پاکستان کی مجاہدانہ جدوجہد میں شریک کیا جائے۔ اس جمعیت کے

سب سے پہلے صدر غائبانہ طور پر شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ چنے گئے۔

حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب داناپوری نے والد ماجد کو اس جمعیت میں شرکت کی دعوت دی تو آپ نے یہ جواب دیا کہ ہنوز میرا اس پر شرح صدر نہیں۔ خوف یہ ہے کہ علماء کے ایک طبقہ سے کانگریس غلط فائدہ اٹھا رہی ہے' باقی طبقہ علماء کو لیگ غلط طور پر آلۂ کار بنالے' اس طرح کہیں علماء دین کی آزادیٔ ضمیر دوسروں کی دست نگر ہو کر نہ رہ جائے۔ اسی تردّد کی بناء پر تحریک پاکستان کی مکمل حمایت کے باوجود آپ ایک عرصہ تک اس جمعیت کے باضابطہ رکن نہیں بنے۔

مگر تحریکِ پاکستان کی روز افزوں ضرورت نے اس حالت پر دیر تک قائم رہنے نہ دیا۔ اور جو خدشات آپ کے دل میں تھے' شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ جیسی عظیم ...... قیادت کی موجودگی میں ان کی بھی کوئی وجہ باقی نہ رہی چنانچہ جمعیت کے اجلاس کانپور میں جمعیت کی باضابطہ رکنیت اختیار فرمائی اور ساتھ ہی آپ کو عاملہ کا رکن بھی نامزد کردیا گیا۔

تقسیم سے قبل دورۂ سندھ

یکم ربیع الاول ۱۳۶۶ھ مطابق ۲۴ جنوری ۱۹۴۷ء کو جمعیتہ علماء اسلام کی ایک عظیم الشان کانفرنس حیدر آباد سندھ میں منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کو کرنا تھی مگر بروقت ان کو شدید علالت پیش آگئی تو حضرت والد صاحبؒ کو اس کانفرنس کی صدارت کے لئے سندھ روانہ کیا۔ بھائی جان اس دورہ میں بھی دیوبند سے ساتھ آئے تھے۔

یہاں کے علماء و عوام کے عظیم الشان تاریخی اجتماع میں آپ نے جو خطبہ صدارت پڑھا سیاست کے اسلامی اصولوں کا بے نظیر مرقع ہے' اس میں آپ نے سیاسی قیادت کے شرعی اصول اور غیر صالح امیر کی اطاعت کے شرعی حدود پر سیر حاصل بحث فرمانے کے بعد معترضین کے جوابات اور علماء و عوام کے فرائض دل نشین انداز میں بیان فرمائے۔ یہ خطبۂ صدارت اس زمانہ میں ہزارہا کی تعداد میں طبع ہوا لیکن پاکستان بن جانے کے بعد اس کی دوبارہ اشاعت نہ ہو سکی۔

قائداعظم کی قیادت پر ایک اعتراض اور اس کا جواب

کانگریسی خیال رکھنے والے مسلمان جو گاندھی جی' پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کی قیادت کو شرعاً جائز قرار دے رہے تھے ان کا ایک بڑا اعتراض مسلم لیگ پر یہ تھا کہ اس کے لیڈر علم دین سے بے بہرہ اور اسلامی شعائر سے بے پروا ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو مسلم لیگ کی بجائے کانگریس کی حمایت کرنا چاہئے۔

حضرت والد صاحبؒ نے اپنے خطبہ صدارت میں اس اعتراض کا جواب قرآن وسنت کی روشنی میں نہایت بسط کے ساتھ دیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث کا مختصر اقتباس یہاں پیش کردیا جائے۔

مسئلۂ قیادت

"اس جگہ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی جماعت یا انجمن کا صدر و قائد ہونا اور چیز ہے اور امارت شرعیہ اور چیز ہے۔ بہت سے شبہات صرف یہاں سے پیدا ہوتے ہیں کہ ایک جماعت کے قائد کو اصطلاحی شرعی امیر قرار دے کر اس کے احکام اس پر جاری کئے جاتے ہیں اور اس کی تمام شرائط وصفات اس میں ڈھونڈی جاتی ہیں۔

مسلمانوں نے مسٹر محمد علی جناح کو موجودہ جنگ آزادی کا ایک ماہر فن جرنیل ہونے کی حیثیت سے قائداعظم قرار دیا ہے، نہ اس حیثیت سے کہ وہ کوئی مفتی ہیں ان سے حلال وحرام کے احکام میں فتویٰ لیا جائے گا۔ یا اس حیثیت سے کہ وہ کوئی شیخ مرشد ہیں ان سے اصلاح اعمال کا کام لیا جائے گا۔ میرے خیال میں شاید ایک مسلمان بھی یہ خیال لے کر ان کو قائد نہیں کہتا' ان کی قیادت ہندوستان کی مسلم جمہوریت نے صرف اس لئے تسلیم کی ہے کہ انگریز اور ہندو دونوں اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں اور انگریز اس وقت خواہ بین الاقوامی مقتضیات سے یا اندرونی چیخ وپکار سے متاثر ہو کر جس قسم کی بھی آزادی ہندوستان کو دینا چاہتا ہے، ہندو اپنی عددی اکثریت' مستحکم تنظیم اور بے حدوشمار سرمایہ کے بل بوتہ پر اس کا تنہا مالک بننا چاہتا ہے۔ اس کا کھلا ہوا منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی مستقل قوم اور

ہندوستان کی عام اقلیتوں کو اپنا غلام بنائے رکھے' اس کے لئے اس وقت جنگ جاری ہے اور ظاہر ہے کہ یہ جنگ توپ تفنگ کی نہیں محض آئین اور قانون کی ہے۔

اور ادھر باتفاق موافق و مخالف یہ امر مسلّم ہے کہ اس جنگ کے لئے مسٹر محمد علی جناح سے بہتر جرنیل نہ صرف یہ کہ مسلمانوں میں نہیں بلکہ کسی دوسری قوم میں بھی نہیں۔ کس قدر بد نصیبی ہے اس قوم کی جو اپنے اندر ایسا جرنیل رکھتے ہوئے اس کو میدان عمل میں بڑھانے یا اس کے جھنڈے کے نیچے جنگ آزادی لڑنے میں اس لئے تامل کرے کہ وہ اپنے جرنیل میں تقویٰ و طہارت کے خاص اوصاف نہیں پاتی۔ ریل' موٹر' جہاز کا ڈرائیور اور کپتان مقرر کرنے کے وقت بڑے سے بڑا متقی' دین دار اور دانشمند صرف اس کا اطمینان کرلینا ضروری سمجھتا ہے کہ وہ ڈرائیوری کے فن میں ماہر اور مکمل ہے یا نہیں۔ اس میں اعتماد ہو جانے کے بعد اس کے ذاتی اعمال و افعال کا اچھا ہونا نہ عقلاً اس کی گاڑی میں سوار ہونے سے مانع ہو سکتا ہے نہ شرعاً۔

اس پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کاموں کے لئے مسلمان ہونا بھی شرط نہیں تو اس سے گاندھی اور نہرو کی قیادت کا جواز بھی نکل آیا۔ کیونکہ ہندوؤں کی مسلم دشمنی کا مشاہدہ ہو جانے کے بعد ان کی مثال اس ڈرائیور کی سی ہے جس کے متعلق معلوم ہے کہ وہ ہمارے خون کا پیاسا ہے۔ اس نے موقع پایا تو ہلاک کئے بغیر نہ چھوڑے گا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اس کی گاڑی میں سوار ہو کر اپنی جان اس کے سپرد کر دینا نہ عقلاً جائز ہو سکتا ہے نہ شرعاً۔

اس میں شبہ نہیں کہ تقویٰ و طہارت اسلام کا مقصود اعظم ہیں اور مسلمانوں کے ہر کام کو چلانے والے اگر متقی پارسا آدمی میسر آجائیں تو بلاشبہ سعادت کبریٰ اور موجب برکات ہے لیکن جو کام لینا ہے اس کا ماہر اگر کوئی متقی موجود نہ ہو یا وہ کام کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو یا اس کو اسباب میسر نہ ہوں تو غیر متقی ماہر فن سے وہ کام لینا آج اس شرالقرون اور فسق و فجور کے زمانہ میں نہیں بلکہ خیرالقرون میں بھی جرم نہیں سمجھا گیا۔

شرعی دلائل

حافظ ابن تیمیہ ؒ نے اپنی کتاب السیاسۃ الشرعیہ میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ (جو جلیل القدر تابعی اور حضرت عمر فاروقؓ کے نقش قدم پر امور خلافت کو انجام دینے

کے سبب عمر ثانی کہلاتے تھے) آپ کے کسی صوبہ دار حاکم نے آپ سے یہ سوال کیا کہ میں ایک فوجی عہدہ کسی شخص کے سپرد کرنا چاہتا ہوں اور دو آدمی میری نظر میں ہیں ایک تو نہایت قوی اور فنون حرب سے واقف ہے مگر متقی پابند شرع نہیں اور دوسرا نہایت متقی پارسا ہے مگر قوی اور ماہر فن نہیں۔ آپ فیصلہ فرمائیں کہ ان دونوں میں سے کس کو یہ منصب سپرد کروں؟

آپ نے جواب میں کہا کہ :

"قوی کی قوت تو مسلمانوں کے کام آوے گی اور اس کے برے اعمال کی خرابی اس کی ذات کو پہنچے گی اور متقی کا تقویٰ اس کی ذات کے لئے اور اس کے ضعف یا ناواقفیت سے جو نقصان ہوگا وہ سب مسلمانوں کو بھگتنا پڑے گا۔ اس لئے اس کام کے واسطے قوی غیر متقی کا انتخاب کرنا چاہئے۔"

آگے حضرت والد صاحبؒ نے قرآن و سنت اور تاریخ کے جو ٹھوس دلائل اس مسئلہ پر ذکر کئے ہیں، قابل دید ہیں۔

غرض شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کی قیادت میں ان حضرات نے انتھک جدوجہد اور مجاہدانہ سرگرمی سے کام لے کر قرآن و سنت کے دو اٹل قانون مسلمانوں کے دلوں میں راسخ کردیئے۔

ایک یہ کہ دنیا کے تمام مسلمان ایک ملت ہیں اور کافر بالکل دوسری ملت۔ یہ دو متضاد ملتیں بھائی بھائی نہیں ہوسکتیں۔ وطن کی بنیاد پر انھیں ایک قوم یا ایک برادری نہیں کہا جاسکتا۔

دوسرا یہ کہ مسلمان دینی اعتبار سے کتنا بھی گیا گزرا ہو مگر کافر و مشرک سے بہرحال بہتر ہے۔ ہندو اکثریت کی حکومت کو اپنے اوپر اپنے اختیار سے مسلط کرنا مسلمانوں کے لئے کسی حال جائز نہیں۔ ان اکابر علماء کی تصانیف فتاویٰ اور تحریروں وتقریروں سے مسلمانوں پر جب یہ بات واضح ہوگئی کہ قیام پاکستان کا مطالبہ درحقیقت قرآن و سنت کے اصولوں پر مبنی ہے اور کانگریس کا پھیلایا ہوا کافرانہ جال مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی سے نکال کر ہندوؤں کی بدترین غلامی میں پھانسنے کے لئے بنا گیا ہے تو وہ جوق در جوق مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہوتے چلے گئے۔

مسلمانوں کو ایک مغالطہ یہ دیا جاتا تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ نے بھی تو ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل کیا تھا اگر وہ جائز تھا تو اب کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کیوں جائز نہیں؟

حضرت والد صاحبؒ نے اپنے رسالہ مسلم لیگ اور کانگریس کے متعلق شرعی فیصلہ میں اس کا نہایت مفصل جواب دیا کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل کو اس لئے گوارا کیا تھا کہ اس وقت قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی ہندو اس قیادت کے پیچھے چل رہے تھے چنانچہ اگر ہندوستان اس وقت آزاد ہوا ہوتا تو حکومت مسلمانوں کو ملتی۔ ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام میں کافروں سے جزوی طور پر مدد لینا فی نفسہ کوئی ناجائز کام نہیں اور اب معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے کہ کانگریس کی قیادت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر پورے ہندوستان کا مرکزی اقتدار کانگریس کو ملا تو پورے ملک پر ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہوجائے گی اور اپنے اختیار سے کسی کافر حکومت کو اپنے اوپر مسلط کرنے کی اسلام کسی حال اجازت نہیں دیتا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے بھی اسے کبھی جائز قرار نہیں دیا۔

قیام پاکستان کا فیصلہ

چنانچہ ۲۷ نومبر ۴۵ء کے انتخابات جو متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے لئے ہوئے تھے، ان میں تمام مسلم نشستیں مسلم لیگ کو ملیں۔ یہ سو فیصد کامیابی قیام پاکستان کے لئے سنگ میل ثابت ہوئی، کیونکہ اسمبلی کو ہندوستان کا آئین بنانا تھا اور ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ بھی بڑی حد تک اسی کو کرنا تھا۔

اس کے بعد ۱۹۴۶ء کے صوبائی انتخابات میں بھی مسلم لیگ نے دو قومی نظریہ کا لوہا منوالیا۔ اور ثابت کردیا کہ مسلمان ہندوؤں کی غلامی کے لئے تیار نہیں۔ بالآخر انگریز، ہندو، سکھ تینوں قوموں کو مطالبہ پاکستان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا، اور تقسیم ہند کے لئے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ طے ہوگئی۔

قیام پاکستان اور تقسیم ہند کا جو نقشہ تجویز کیا گیا تھا اس پر غور کرنے کے لئے ۹ جون ۱۹۴۷ء کو قائداعظم نے مرکزی اسمبلی کے تمام مسلم ارکان کا اجلاس دہلی میں طلب کیا۔ اگرچہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت والد ماجدؒ اسمبلی کے رکن نہ تھے، مگر خصوصی دعوت پر یہ دونوں حضرات بھی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اجلاس نے متفقہ

طور پر قیام پاکستان کا مجوزہ نقشہ منظور کرلیا۔

سلہٹ اور صوبہ سرحد کا ریفرنڈم

مگر ہندو انگریز گٹھ جوڑ نے قیام پاکستان کے فیصلہ میں ایک شق یہ بڑھا دی تھی کہ سلہٹ اور صوبہ سرحد پاکستان میں شامل ہوں یا بھارت میں؟ اس کا فیصلہ وہاں کے عوام سے بذریعہ ریفرنڈم (استصواب) کرایا جائیگا۔ حالانکہ ۴۵ء کے انتخابات میں یہاں کے مسلمان بھی اپنا ووٹ پاکستان کے حق میں دے چکے تھے، مگر یہ شق پنڈت نہرو نے اس وجہ سے رکھوائی تھی کہ صوبہ سرحد میں اس وقت کانگریسی وزارت قائم تھی جو خان برادران چلا رہے تھے، اس کانگریسی وزارت نے بھی گاندھی اور نہرو کے عزائم کے لئے فضا خوب بنائی تھی اور پاکستان کے حامی سیکڑوں علماء کرام کو جیلوں میں بند کردیا گیا تھا[1] اس لئے اکثر مسلمان کو سلہٹ اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم کی بڑی فکر تھی۔

یہ تھے وہ حالات جن میں متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے مسلم ارکان کی یہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔

قائداعظم سے دوسری ملاقات[2]

اس کانفرنس سے فارغ ہوکر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت والد صاحبؒ نے ۱۱ جون ۱۹۴۷ء کو قائداعظم سے دہلی میں ان کی قیام گاہ پر ملاقات فرمائی۔ قائداعظم نے کھڑے ہوکر پرجوش خیر مقدم کیا، شیخ الاسلامؒ

[illegible] مبارکبادے [illegible] کو آپ ہیں کہ آپ ہی کی کوششوں سے یہ کامیابی ہو[illegible] ہے۔"

---

[1] تحریک پاکستان اور علماء ربانی ص ۶۲ (بحوالہ خطبہ صدارت شیخ الاسلام فروری ۱۹۴۹ء ڈھاکہ)

[2] والد صاحبؒ کی پہلی ملاقات ۳۹ء میں ہوئی تھی جس کی کچھ تفصیل بہت پیچھے بیان ہوچکی ہے۔ ان دونوں ملاقاتوں کا حال احقر نے والد صاحبؒ سے خود سنا ہے مگر جو تفصیلات یاد نہ تھیں وہ کتاب "تحریک پاکستان اور علماء ربانی" سے لی گئی ہیں۔

اس کے بعد قائد اعظم نے کہا کہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ سلہٹ اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم کا ہے' اگر پاکستان اس ریفرنڈم میں ناکام رہا تو بہت بڑا نقصان ہوگا۔

ان حضرات نے فرمایا کہ انشاء اللہ پاکستان اس میں کامیاب ہوگا بشرطیکہ آپ اعلان کریں کہ پاکستان میں اسلامی نظام جاری ہوگا۔

اس پر قائد اعظم نے کہا :

"میں پاکستان کے مقدمہ میں مسلمانوں کا وکیل تھا' اللہ تعالیٰ نے ان کو اس مقدمہ میں کامیاب کیا' پاکستان ان کو مل گیا۔ اب میرا کام ختم ہوا۔ اب مسلمانوں کو اختیار حاصل ہے کہ جس طرح کا چاہیں نظام قائم کریں اور چونکہ پاکستان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے تو اس کے سوا کوئی دوسری صورت ہو ہی نہیں سکتی کہ یہاں اسلامی نظام اور اسلامی ریاست قائم ہو۔"

اسی ملاقات میں یہ طے ہوا کہ سلہٹ کا دورہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ فرمائیں اور صوبہ سرحد کا دورہ شیخ الاسلام اور حضرت والد صاحبؒ فرمائیں گے۔

پختونستان کی سازش

جب تک قیام پاکستان کا فیصلہ نہ ہوا تھا' کانگریس کی طرف سے ایک ہی رٹ لگائی جا رہی تھی کہ ہندوستان میں بسنے والی تمام قومیں' ہندو مسلم' سکھ وغیرہ خواہ کسی صوبے کے باشندے ہوں' سب مل کر ایک قوم ہیں' ان کا وطن بھی ایک ہونا چاہئے لہٰذا مسلمانوں کی الگ حکومت پاکستان کی صورت میں قائم کرنیکا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس پورے عرصہ میں کسی نے پختونستان کا نعرہ بلند نہیں کیا' حالانکہ ہندوستان جو اُس وقت چودہ پندرہ صوبوں کا ملک تھا اس میں صوبہ سرحد کی حیثیت ایک چھوٹے سے صوبے کی ہوتی اور متحدہ ہندوستان کی مرکزی حکومت میں اقتدار ہمیشہ ہندوؤں کے ہاتھ میں ہوتا۔

سرحدی گاندھی (خان عبدالغفار خان) اور انکے ساتھیوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ ہندوستان متحد رہے' مرکز میں ہندوؤں کا اقتدار ہو' اور صوبہ سرحد کے غیور مسلمان ہندوؤں کے زیر نگین ہوں لیکن جب انگریز اور ہندوؤں نے پاکستان کا مطالبہ مان لیا تو پاکستان کا ہر صوبہ انہیں الگ قوم نظر آنے لگا اور صوبائی قومیت کی بنیاد پر انہوں نے شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ اور حضرت

والد صاحبؒ کے دورہ سرحد سے پہلے ہی یہاں پختونستان کا نعرہ بلند کرا دیا۔ چنانچہ

"سرحد کی کانگریسی پارٹی، خدائی خدمت گار اور زئی پختون کی ایک مشترکہ نشست منعقد ہوئی جس میں ریزولیشن پاس کیا گیا کہ تمام پختونوں کی ایک آزاد ریاست کا اعلان کیا جائے۔ یہ جلسہ سوکڑی ضلع بنوں میں منعقد ہوا تھا۔[1]" (ا۔پ)

درحقیقت یہ پاکستان کو لنگڑا لولا کرنے کے لئے کانگریس کی ایک چال تھی جس نے ریفرنڈم کی شرط تو رکھوا دی تھی مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی دیکھ کر پریشان تھی کہ قیام پاکستان کے لئے سرحد کے غیور مسلمان کا جوش و خروش دوسرے صوبوں سے کم نہیں اور اس کی امید بہت کم تھی کہ کوئی بھی غیرتمند مسلمان صوبہ سرحد کا الحاق پاکستان کی بجائے بھارت کی کافرانہ حکومت کے ساتھ پسند کرے گا۔ اس لئے کانگریس نے مسلمانوں میں صوبہ وارانہ تعصب کی آگ بھڑکا کر یہ چاہا تھا کہ اگر صوبہ سرحد بھارت کو نہ مل سکے تو یہ فائدہ بھی کم نہیں کہ وہ پاکستان سے بھی الگ ایک مستقل ریاست بنے جس کے دو فائدے ہوں گے، ایک یہ کہ پاکستان کمزور ہو گا دوسرا یہ کہ پختونستان بھارت کیلئے نوالہ تر ہو گا کہ جسے ہڑپ کر جانا اس کے لئے ہر وقت ممکن ہو گا۔ اسی مستقل ریاست کا نام پختونستان رکھا گیا تھا اور یہ نعرہ چونکہ صوبائی تعصب پر مبنی تھا اس لئے اس کے چل جانے کی امید تھی، جس کے لئے کانگریس کے پورے وسائل حرکت میں آ چکے تھے۔

سرحد کے دیندار اور غیور مسلمان پختونستان کی شدت سے مخالفت کر رہے تھے جن میں وہاں کے اس وقت کے مشہور مشائخ پیر مانکی شریف اور پیر زکوڑی شریف بطور خاص قابل ذکر ہیں مگر یہ سب حضرات اس کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ دیوبند کے اکابر علماء یہاں آ کر عوام کو صحیح دینی صورتحال سے آگاہ فرمائیں۔ یہاں کے عوام دینی امور میں علماء دیوبند کے علاوہ کسی کی بات پر بھروسہ نہ کرتے تھے۔

یہ تھے وہ نازک حالات جن میں آپ نے شیخ الاسلامؒ کی معیت میں صوبہ سرحد کا دورہ کیا اور بظاہر حالات اسی کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے صوبہ سرحد کے غیور مسلمانوں کو ہندوستان کی غلامی سے بچایا۔

---

[1] تحریک پاکستان اور علماء ربانی ص ۱۵۷۔ بحوالہ روزنامہ آزاد لاہور، وانصاری دہلی مورخہ ۲۵ جون ۱۹۴۷ء

ریفرنڈم کے موقع پر صوبہ سرحد کا تاریخی دورہ

یوں تو قیام پاکستان کی جدوجہد میں حضرت والد صاحبؒ نے پورے ہندوستان کے طول وعرض کے دورے کئے اور جگہ جگہ عام وخاص جلسوں سے خطاب فرمایا' آپ کا مدراس ودکن کا دورہ بھی بہت کامیاب دورہ تھا لیکن ریفرنڈم کے نازک موقع پر صوبہ سرحد کا یہ دورہ تاریخی اور انقلابی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ کانگریس نے "پختونستان" کے پردے میں سرحد کے غیور مسلمانوں کو غلام بنانے اور پاکستان کو لنگڑا لولا کرنے کے لئے جو خطرناک جال پھیلایا تھا وہ اسی دورے سے تار تار ہوا۔ پیر صاحب مانکی شریفؒ اور پیر زکوڑی شریف نے اس دورے کا انتظام کیا تھا وہ خود بھی ان حضرات کے ساتھ مجاہدانہ سرگرمی سے شریک رہے۔

یہ سخت گرمی کا موسم تھا مگر یہ حضرات صوبہ بھر میں شہر شہر' گاؤں گاؤں پھر کر کلمہ حق پہنچاتے رہے۔

فتح مبین

اللہ تعالیٰ نے ان مخلصانہ کوششوں کو ایسا شرف قبول عطا فرمایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پوری فضا پاکستان کے حق میں جوش وخروش سے بھر گئی اور جب ریفرنڈم ہوا تو اس میں سرحد کے غیور مسلمانوں نے اپنا یہ قطعی فیصلہ دے دیا کہ صوبہ سرحد اور پاکستان ایک ہے اور ایک رہیں گے۔

سیاسی مبصرین کی فیصلہ کن یہ قطعی رائے ہے کہ اگر اس وقت میں شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ اور حضرت والد صاحبؒ سرحد کا دورہ نہ فرماتے اور پیر مانکی شریف و پیر زکوڑی شریف کے اپنے اثرات پوری طرح کام نہ کرتے تو ریفرنڈم میں پاکستان کی کامیابی ممکن نہ تھی۔

حضرت والد صاحبؒ نے اس سفر سے دیوبند واپسی پر وہاں کے بہت سے ایمان افروز واقعات اور پاکستان کے لئے مسلمانان سرحد کے اس ایمانی جوش وخروش کی ولولہ انگیز تفصیلات سنائی تھیں جن کا جگہ جگہ مشاہدہ ہوا' بھائی جان اس سفر میں بھی حضرت والد

ریفرنڈم کے موقع پر صوبہ سرحد کا تاریخی دورہ

یوں تو قیام پاکستان کی جدوجہد میں حضرت والد صاحبؒ نے پورے ہندوستان کے طول وعرض کے دورے کئے اور جگہ جگہ عام وخاص جلسوں سے خطاب فرمایا' آپ کا مدراس ودکن کا دورہ بھی بہت کامیاب دورہ تھا لیکن ریفرنڈم کے نازک موقع پر صوبہ سرحد کا یہ دورہ تاریخی اور انقلابی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ کانگریس نے "پختونستان" کے پردے میں سرحد کے غیور مسلمانوں کو غلام بنانے اور پاکستان کو لنگڑا لولا کرنے کے لئے جو خطرناک جال پھیلایا تھا وہ اسی دورے سے تار تار ہوا۔ پیر صاحب مانکی شریفؒ اور پیر زکوڑی شریف نے اس دورے کا انتظام کیا تھا وہ خود بھی ان حضرات کے ساتھ مجاہدانہ سرگرمی سے شریک رہے۔

یہ سخت گرمی کا موسم تھا مگر یہ حضرات صوبہ بھر میں شہر شہر' گاؤں گاؤں پھر کر کلمہ حق پہنچاتے رہے۔

فتح مبین

اللہ تعالیٰ نے ان مخلصانہ کوششوں کو ایسا شرف قبول عطا فرمایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پوری فضا پاکستان کے حق میں جوش وخروش سے بھر گئی اور جب ریفرنڈم ہوا تو اس میں سرحد کے غیور مسلمانوں نے اپنا یہ قطعی فیصلہ دے دیا کہ صوبہ سرحد اور پاکستان ایک ہے اور ایک رہیں گے۔

سیاسی مبصرین کی فیصلہ کن یہ قطعی رائے ہے کہ اگر اس وقت میں شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ اور حضرت والد صاحبؒ سرحد کا دورہ نہ فرماتے اور پیر مانکی شریف وپیر زکوڑی شریف کے اپنے اثرات پوری طرح کام نہ کرتے تو ریفرنڈم میں پاکستان کی کامیابی ممکن نہ تھی۔

حضرت والد صاحبؒ نے اس سفر سے دیوبند واپسی پر وہاں کے بہت سے ایمان افروز واقعات اور پاکستان کے لئے مسلمانان سرحد کے اس ایمانی جوش وخروش کی ولولہ انگیز تفصیلات سنائی تھیں جن کا جگہ جگہ مشاہدہ ہوا' بھائی جان اس سفر میں بھی حضرت والد

صاحبؒ کے ساتھ تھے' ہم کبھی ان سے اور کبھی والد صاحبؒ سے وہاں کے دلچسپ واقعات سنا کرتے تھے۔ افسوس کہ طوالت کا خوف ان کے بیان سے مانع ہے۔

ریفرنڈم کا جو نتیجہ صوبہ سرحد میں سامنے آیا سلہٹ کا نتیجہ بھی اس سے مختلف نہ تھا' اس محاذ کو حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے سر کیا تھا۔

مضبوط پاکستان کے قیام میں یہی ریفرنڈم کا مرحلہ باقی تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بوریہ نشین علماء حق کے ذریعہ مسلمانوں کو سرخروئی عطا فرمائی۔

پہلے جشن آزادی پر پاکستان میں پرچم کشائی

۲۷ رمضان المبارک، ۱۳۶۶ھ کی شب میں گویا نزول قرآن کی سالگرہ کے وقت ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا اقتدار اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ہاتھ میں دیدیا اور پاکستان سب سے بڑی مسلم ریاست بن کر دنیا کے نقشہ پر نمودار ہوا۔ اس روز پاکستان میں سب سے پہلا جشن آزادی منایا جانے والا تھا' اس میں شرکت کے لئے دیوبند سے شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ اور حضرت والد صاحبؒ کو بھی مدعو کیا گیا لیکن حضرت والد صاحبؒ شدید علالت کے باعث سفر نہ فرما سکے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کراچی تشریف لے آئے اور قائداعظم کی خواہش پر اس تقریب میں پاکستان کا سبز ہلالی پرچم آپ ہی نے اپنے دست مبارک سے بلند فرمایا۔ ادھر مشرقی پاکستان ڈھاکہ میں پرچم کشائی کی رسم حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے انجام دی۔

زندگی کا تیسرا دور' ہجرت پاکستان

قیام پاکستان مسلمانوں کی جدوجہد کا پہلا مرحلہ تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں خصوصی نصرت وحمایت سے نوازا تھا۔ اب دوسرا مرحلہ یہاں اسلامی نظام حیات قائم کرنے کا تھا جو والد صاحبؒ کی نظر میں پہلے سے زیادہ صبر آزما اور کٹھن مرحلہ تھا' اس میدان میں جدوجہد کے لئے حضرت والد صاحبؒ جلد از جلد پاکستان آنا چاہتے تھے مگر قیام پاکستان کے فوراً بعد ہندوؤں کی سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق دہلی' مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوگیا' تمام راستے مسدود تھے' کچھ طبعی اور

۴۔ جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (دکن)

ان حضرات کو مع اہل و عیال پاکستان لانے اور ان کے سفر کا مکمل انتظام شیخ الاسلامؒ نے نجی طور پر بعض حضرات کے تعاون سے کیا تھا۔

ہجرت پاکستان ہمارے لئے تو محض ایک شوق تھا مگر حضرت والد صاحبؒ کے لئے پیچیدہ مسئلہ اور زندگی کا بہت بڑا انقلاب تھا جسے برداشت کرنے کے لئے خود کو آپ کافی عرصہ سے تیار فرما رہے تھے۔ بالآخر حضرت شیخ الاسلامؒ کی دعوت اور مقصد کی اہمیت کے پیش نظر آپ نے وطن مالوف سے ہجرت کا قطعی فیصلہ فرمالیا اور ۲۰ جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ کیم مئی ۱۹۴۸ء کو اپنے قدیم وطن دیوبند کو خیرباد کہہ کر کراچی کے لئے روانہ ہوگئے۔

اسی سال میں ہمارے مکان کی توسیع و تعمیر مکمل ہوئی تھی' تعمیر کے دوران ہی شاید ہجرت کا خیال والد صاحب کے ذہن میں تھا ورنہ سفر آخرت تو ہر وقت پیش نظر رہتا ہی تھا چنانچہ جب تعمیر مکمل ہونے لگی تو آپ نے مکان کے صحن کی اونچی دیوار پر سیمنٹ کے ایک بڑے چوکھٹے میں یہ شعر جلی حروف میں کندہ کرادیا تھا۔

دنیا کا کچھ قیام نہ سمجھو کرو خیال
اس گھر میں تم سے پہلے بھی کوئی مقیم تھا

اب اس مکان میں ہندو رہتے ہیں اور یہ شعر اب بھی اسی طرح کندہ ہے۔

غرض دیوبند سے روانگی کے بعد ہم نے ایک روز دہلی میں قیام کیا' پھر ایک روز جودھ پور میں' اور ایک روز حیدر آباد سندھ میں قیام کرتے ہوئے ۲۶ جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ مطابق ۶ مئی ۱۹۴۸ء کو پاکستان کے دارالحکومت کراچی پہنچ گئے۔

اس ہجرت کا مختصر واقعہ حضرت والد صاحبؒ نے اپنے رسالہ "نقوش و تاثرات"[1] کے مقدمہ میں بیان فرمایا ہے وہ یہاں حضرت والد صاحبؒ ہی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے' کہیں کہیں قوسین میں عبارت کا اضافہ احقر کی طرف سے ہوگا۔

---

[1] یہ رسالہ ہجرت کے تیرہ سال بعد اس وقت تحریر فرمایا تھا جب آپ اعزہ و احباب سے ملاقات کیلئے پاکستان سے دیوبند' تھانہ بھون اور دہلی تشریف لے گئے' یہ رسالہ وہیں کا سفرنامہ بلکہ نصائح اور عبرتوں کا دلکش مرقع ہے۔ جگہ جگہ دیوبند و تھانہ بھون کے بصیرت افروز واقعات نے اسے اور بھی دلچسپ و مفید بنا دیا ہے۔ اسی کے مقدمہ میں اپنی ہجرت پاکستان کا واقعہ بھی تحریر فرمایا ہے جو یہاں نقل کیا جارہا ہے۔

ہجرت پاکستان کی کہانی والد ماجدؒ کی زبانی

فرماتے ہیں کہ :

"پاکستان وجود میں آیا تو اس کی محبت اور اس میں پیش آنے والی دینی اور علمی ضرورتوں کے تصور نے ترک وطن کے جذبات دل میں پیدا کرنے شروع کر دیئے۔

دیوبند۔ میں جو میرے لئے صرف وطن جسمانی نہیں بلکہ مدینہ طیبہ سے لائے ہوئے علوم کے ایک مرکز کی حیثیت سے وطن ایمانی بھی تھا۔ عمر عزیز کے ترپن سال اسی کی سرزمین میں گزرے اسی میں بال سفید ہوئے۔ کبھی ایک مہینہ سے زائد اس سے غیر حاضر نہ رہا۔ صرف ۱۳۴۶ھ کے پہلے حج میں ڈھائی ماہ دیوبند سے باہر رہنے کی نوبت آئی تھی اور وہ بھی میرے لئے انتہائی مجاہدہ تھا۔ اس کی فطری محبت کا یہ عالم کہ جب کبھی وطن سے سفر ہوتا تو مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔

تَلَفَّتُّ نَحْوَ الْحَيِّ حَتّٰى وَجَدْتُنِيْ

وَجِعْتُ مِنَ الْاِصْغَاءِ لِيْتًا وَّ اَخْدَعًا

"میں نے وطن کی طرف مڑ مڑ کر اتنا دیکھا کہ میری گردن کی رگیں دکھنے لگیں۔"

ایک طرف وطن مالوف کی محبت کا گہرا نقش' عیال کی کثرت' مالی وسائل کا فقدان زنجیر پا بنے ہوئے ہلنے کی اجازت نہیں دیتے' دوسری طرف یہ نیا ملک پاکستان جو مدتوں کی تمنا اور ہزاروں کوششوں اور محنتوں کے بعد وجود میں آیا' اس کی طرف جانے اور وہاں اس ملک کو صحیح معنی میں اسلامی ملک بنانے کے لئے جدوجہد کا جذبہ ترک وطن پر مجبور کر رہا تھا۔

دیوبند کا مکان اور باغ

ایک اور عجوبہ قدرت یہ تھا کہ میں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ اپنے جدی مکان کے ایک چھوٹے سے کمرے میں پانچ بچوں کے ساتھ نہایت تنگی سے گزارا تھا' اس دور انقلاب سے چند سال پہلے (۱۳۵۱ھ) میں حق تعالیٰ نے ایسے اسباب جمع فرما دیئے کہ جدی مکان کے

عقب میں ایک افتادہ زمین خرید کر اپنا نیا مکان دو منزلہ اپنی مرضی اور ضروریات کے مطابق بنا لینے میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ ساتھ ہی فارغ اوقات یک سوئی سے گزارنے کے لئے شہر کے قریب ایک باغیچہ اپنے ہاتھ سے لگایا۔ عجیب اتفاق تھا کہ جس سال میں مکان کی تعمیر (میں توسیع) مکمل ہوئی۔ اسی سال میں باغ پر پہلا پھل نمودار ہوا۔ اور یہی وہ وقت تھا جب ترک وطن کا جذبہ دل میں ابھر رہا تھا اور بالآخر اللہ تعالیٰ کے نام پر اس دار و دیار اور گھر اور باغ کو چھوڑ کر پاکستان جانے کا فیصلہ جمادی الثانیہ (۱۳۶۷ھ) اپریل ۱۹۴۸ء میں کر لیا گیا۔

روانگی

اپنے ساتھ صرف غیر شادی شدہ بچے اور ان کی والدہ تھی اور گھریلو سامان میں صرف بدن کے کپڑے اور علمی سامان میں سے صرف اپنے مسودات' باقی سب عیال اور سامان اور کتب خانہ دیوبند میں چھوڑ کر ۲۰ جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ یکم مئی ۱۹۴۸ء کو دہلی کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہاں سے براہ جودھ پور' کھوکھرا پار کراچی پاکستان میں منتقل ہو گیا۔

کراچی میں

پاکستان میں ایسے مقامات بھی تھے جو اپنے وطن سے قریب ہوا فضا کے اعتبار سے ملتے جلتے تھے مگر تقدیر ازلی میں ہماری جگہ اس مقام میں لکھی تھی جو وطن کے اعتبار سے پاکستان کا سب سے بعید علاقہ تھا' وطن سے نکلے بھی تو کہاں پہنچے؟ مجھ جیسے کم ہمت جتلائے حب وطن کے لئے جس کو ابھی ابھی مرضی کے مطابق گھر نصیب ہوا اور اپنے لگائے ہوئے باغ کا پہلا پھل اپنی ابتدائی حالت میں نمودار ہوا۔ یہ وقت بہت ہی صبر آزما تھا اور کسی طرح اندازہ نہ تھا کہ اس عظیم انقلاب کو برداشت کر سکوں گا' لیکن اللہ تعالیٰ کے انعامات کا شکر کس زبان سے ادا ہو کہ اس نے اسی وقت میرے قلب کو ان سب چیزوں سے ایسا بے نیاز بنا دیا کہ حیرت ہوگئی جس وقت میں نے مکان سے قدم نکالا' مکان میرے دل سے نکل گیا۔

حسن اتفاق

حسن اتفاق سے یہ ہجرت اس وقت ہوئی جب کہ میری عمر ترپن سال کی تھی' جس

سے اللہ تعالیٰ نے ہجرت نبویؐ کی سنت کا اتباع نصیب فرمایا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سن شریف بھی بوقت ہجرت ترپن ہی سال کا تھا۔

زندگی کا نیا دور

نقل وطن کے بعد ایک نئے ملک، نئے ماحول، وطن اصلی سے بہت دور اس کی آب وہوا سے بے حد مختلف شہر کراچی میں ایک ایسے مکان میں (جو عبداللہ ہارون روڈ پر کنگس کورٹ نامی بلڈنگ میں فلیٹ نمبر۸ تھا) قیام کیا جہاں آسمان صرف دریچہ سے نظر آسکتا تھا اور وہ بھی ایک مہربان نے رہنے کے لئے دے دیا تھا، جس کے ہروقت ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ لگا ہوا تھا، جاننے پہچاننے والے گنے چنے چند نفوس تھے، ہروقت بیگانگی ہی بیگانگی کا دور دورہ تھا، جو بچے ساتھ تھے وہ اتنے چھوٹے کے بازار کی ضروریات بھی ان کے سپرد نہ کرسکتا تھا، راستے معلوم نہیں، بازار کا اندازہ نہیں، گھر میں کوئی سامان نہیں، ہرچیز خریدنے بنانے کی ضرورت سامنے، باقی ماندہ عیال اور ضعیف بیوہ والدہ ماجدہ کی مفارقت سے دل زخمی۔

مگر شکر ادا نہیں ہوسکتا اپنے مالک کا کہ اس نے ہر قدم پر دستگیری فرمائی اور ان حالات میں بھی عیال اور والدہ ماجدہ کی فکر تو ہوئی مگر مکان، باغ، جائیداد کبھی بھول کر بھی یاد نہیں آئے۔ اللہ تعالیٰ نے چھ ماہ کے اندر یہ مشکل بھی حل کردی کہ والدہ ماجدہ اور باقی عیال بھی کراچی پہنچ گئے پھر آہستہ آہستہ دوسرے اعزہ واحباب بھی کراچی پہنچنے لگے اور کراچی نے وطن اصلی کی جگہ لے لی۔ سات سال مختلف کرایہ کے مکانوں میں (جیکب لائنز کے کوارٹر نمبر۱۰۵ و نمبر۱۰۶ الف میں اور اس کے بعد برنس روڈ کے قریب "اقبال منزل" میں) کہیں راحت کہیں تکلیف سے گزر گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک وسیع جگہ لسبیلہ ہاؤس پر مکان بنانے کے لئے عطا فرمادی اور وطن کے چھوڑے ہوئے مکان سے اور اپنے ارادہ اور خیال سے کہیں بہتر اور وسیع مکان بن گیا۔

"وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً"[1] (۴: ۱۰۰)

اور مہاجرین کیلئے قرآنی وعدہ ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آگیا اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً[2] (سورہ نحل آیت ۴۱)

---

[1] جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں وسعت اور فراخی پائے گا' ۱۲ منہ

[2] ہم مہاجرین کو دنیا میں (بھی) اچھا ٹھکانہ دیں گے ۱۲ منہ

اور حضرت والد صاحبؒ نے طویل غور وخوض کے بعد مرتب فرمایا تھا' اس کی تیاری اور اس کے بعد اسے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے منظور کرانے میں شیخ الاسلامؒ کو طویل علمی اور سیاسی جدوجہد کرنی پڑی۔ برسراقتدار طبقہ کا ایک گروہ اس راہ میں مسلسل رکاوٹیں کھڑی کر رہا تھا' قائد ملت لیاقت علی خان مرحوم نے اس گروہ کے علی الرغم شیخ الاسلامؒ کی حمایت کی اور اسمبلی میں ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو قرارداد مقاصد خود پیش کر کے اسے منظور کرایا۔ حضرت والد صاحبؒ ان تمام مہمات میں شیخ الاسلام کے ساتھ برابر شریک رہے۔

قرارداد مقاصد کا بالکل ابتدائی کچا خاکہ جو صرف عنوانات اور یادداشتوں پر مشتمل ہے اس کا اصل مسودہ احقر کے پاس عرصہ دراز سے محفوظ ہے' یہ صرف ایک ورق ہے جس کے ایک صفحہ پر حضرت شیخ الاسلام کی اور دوسرے صفحہ پر حضرت والد ماجدؒ کی تحریر ہے۔ اس غرض سے کہ یہ متبرک یادگار محفوظ ہو جائے۔ اس کا عکس ذیل میں دیا جاتا ہے۔

CENTRAL OFFICE

Jamiat Ulama-e-Islam

جمعیۃ علماء اسلام

کراچی

Karachi ....

Ref. No

مورخہ ....

بنیادی مقاصد

یہ تو وطن اور مکان کا افسانہ تھا جس کے لئے انسان اپنی توانائی اور ساری فکر خرچ کرتا ہے اور اچھے برے معاملات کو اختیار کرتا ہے' نیرنگ تقدیر نے آنکھوں سے دکھا دیا کہ یہ سب چیزیں خواب وخیال ہو گئیں اور عقل و شرع نے ہدایت فرمائی کہ جس ماحول میں اب نئی زندگی گزر رہی ہے' اس کی بھی اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں کہ چند روز کے بعد یہ بھی خواب وخیال ہو جانے والی ہے۔

کراچی میں یہ تیرہ[1] سالہ زندگی کن مشاغل میں گزری' اس کی داستان طویل ہے' یہ مختصر سفرنامہ اس کا محل نہیں لیکن اتنا اظہار ناگزیر ہے کہ یہاں پہنچنے کے بعد دو چیزیں مقصد زندگی بن گئیں۔ اول پاکستان میں اسلامی دستور قانون اور نظام اسلامی کے نفاذ کی کوشش۔ دوسرے اس طرف علوم دینیہ کا کوئی مدرسہ کراچی کے شایان شان نہ ہونے کے سبب یہاں کے مناسب حال ایک مدرسہ کا قیام اور تیسری چیز خدمت فتویٰ ہے جو ہر جگہ ساتھ لگی ہی رہتی ہے۔ (نقوش و تاثرات از صفحہ ۱۲ تا ۱۶)

تاریخی کارنامہ "قرارداد مقاصد"

قرارداد مقاصد جو پاکستان کے ہر آئین میں بہ طور دیباچہ شامل چلی آ رہی ہے اور ۱۹۷۳ء کے موجودہ آئین میں بھی شامل ہے[2] یہ وہ اہم قومی دستاویز ہے جس میں مملکت خداداد پاکستان کے مقاصد اور قومی جدو عمل کی سمت' قرآن وسنت کی روشنی میں مقرر کی گئی ہے' اور ان بنیادی حدود کا تعین کیا گیا ہے جن پر دستور سازی کے تمام مراحل انجام پانے تھے اور جن کی پابندی دستور ساز اسمبلی کو اور پاکستان کے ہر آئین کو کرنی تھی۔ یہ تاریخی دستاویز پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے سب سے پہلا ٹھوس قدم تھا' اب تک پاکستان کے دستور و قانون میں جو جو اسلامی دفعات شامل ہوئیں یا آئندہ شامل ہوں گی وہ سب درحقیقت اسی قرارداد مقاصد کی مرہون منت ہیں۔

قرارداد مقاصد اگرچہ دستور ساز اسمبلی میں اس وقت کے وزیر اعظم شہید ملت خان لیاقت علی خان مرحوم نے پیش کی تھی مگر اس کا مسودہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ

---

[1] یہ سفرنامہ حضرت" نے ۱۵ جمادی الثانیہ ۱۳۸۰ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۶۰ کو تحریر فرمایا تھا۔ (رفیع)
[2] بلکہ صدر ضیاء الحق صاحب شہیدؒ کے دور میں تو اسے دیباچے کے بجائے خود آئین کا جزو بنا دیا گیا ہے۔ رفیع

بے سروسامانی

پاکستان کے دستور کا ابتدائی خاکہ جسے تیار کرنے کے لئے والد صاحبؒ پاکستان تشریف لائے تھے پھر قرار داد مقاصد کی تیاری اور اسمبلی سے اسے منظور کرانے کے تمام مراحل اس بے سروسامانی میں انجام پا رہے تھے کہ ضرورت کی کتابیں تک نہ شیخ الاسلامؒ کے پاس تھیں نہ والد صاحبؒ کے پاس' دونوں کے کتب خانے دیوبند میں رہ گئے تھے جو کئی سال کی مسلسل کوشش کے بعد رفتہ رفتہ یہاں پہنچے۔ کراچی میں اس زمانہ میں دینی کتابیں نایاب تھیں صرف ایک لائبریری مجلس علمی میری ویدر ٹاور کے پاس تھی۔ کتابوں سے استفادہ کے لئے دونوں حضرات کو بکثرت وہیں جانا پڑتا تھا۔

اس زمانہ میں معاشی حالات

حضرت والد صاحبؒ کی حیات مبارک کے مختلف مراحل میں معاشی تنگی اور مالی مشکلات بکثرت پیش آئی ہیں مگر ہمیں کبھی تنگی محسوس نہ ہونے دی۔ وہ ہمارے سامنے مالی مشکلات کا ذکر نہ فرماتے تھے۔ ہمارے کسی شوق کو یہ کہہ کر نہ روکتے تھے کہ پیسہ کی کمی ہے اس لئے ہم بچپن ہی سے خود کو مالدار باپ کا بیٹا سمجھتے رہے۔

ہجرت پاکستان کے تین ماہ بعد والد صاحبؒ کے پاس کوئی ذریعہ معاش نہ تھا' مکان بھی کرایہ کا تھا جس کے ہر وقت ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ رہتا تھا' ہم چار بھائی جو پاکستان ساتھ آئے سب کے سب بچے تھے۔ ہماری دو بہنیں غیر شادی شدہ اور محترمہ والدہ صاحبہ ساتھ تھیں' بھائی جان ہنوز دیوبند میں تھے یہاں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو والد صاحبؒ کے کاموں یا کسب معاش میں مدد دے سکے' خود والد صاحبؒ شب و روز قرار داد مقاصد اور اسلامی دستور کی جدوجہد میں مشغول تھے۔ دادا جان رحمتہ اللہ کے خاص شاگرد اور حضرت والد صاحبؒ کے جاں نثار دوست جناب خلیفہ محمد عاقل صاحب کی راشن کی دوکان کراچی میں تھی' راشن والد صاحبؒ کے فرمانے پر ہم لوگ وہاں سے خود جا کر لے آیا کرتے تھے۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب راشن قرض آتا تھا جو والد صاحبؒ نے بعد میں ادا کیا مگر ہمیں والد صاحبؒ نے اس

زمانہ میں بھی اپنی تنگدستی کی ہوا نہ لگنے دی۔

ایک واقعہ

رفتہ رفتہ بھائی جان نے دیوبند سے تجارتی کتب خانہ دارالاشاعت کی کچھ کتابیں بذریعہ ہوائی ڈاک یہاں بھیجنی شروع کیں۔ سب سے پہلے دو کتابوں "معلم الحجاج" اور "زبدۃ المناسک" کے کچھ نسخے آئے۔ یہ دونوں کتابچے احکام حج سے متعلق ہیں صرف حاجی ہی خرید سکتے تھے۔ حسن اتفاق سے زمانہ حج کا تھا اور کراچی کے حاجی کیمپ میں حاجی حضرات ٹھہرے ہوئے تھے۔ والد صاحبؒ کی خواہش تھی کہ یہ کتابیں کوئی وہاں جاکر فروخت کر آئے مگر ہمیں دل شکنی سے بچانے کے لئے یہ احساس بھی دلانا نہ چاہتے تھے کہ کوئی مالی تنگی اس کا سبب ہے۔ باتوں باتوں میں ایک روز مجھ سے اور برادر بزرگوار جناب محمد ولی رازی صاحب سے فرمانے لگے کہ کراچی میں دینی کتابیں ملتی نہیں حاجیوں کو تکلیف ہوتی ہوگی تم دونوں اگر یہ کتابیں حاجی کیمپ میں فروخت کر آؤ تو ہر روپے کی فروخت پر چار آنے انعام ملیں گے۔ ہم بڑی خوشی سے فوراً جانے کے لئے تیار ہوگئے تو والد صاحبؒ نے ہمیں طریقہ بتلایا کہ خیموں کے پاس جاکر کس طرح آواز لگائیں۔ اس زمانہ میں حاجی کیمپ کراچی سنٹرل جیل کے پاس تقریباً اس جگہ لگتا تھا جہاں اب حیدر آباد کالونی ہے۔ دو سائیکلوں پر کئی گھنٹے وہاں آواز لگا لگا کر گشت کیا' بھائی صاحب نے ساڑھے سات روپے کی کتابیں فروخت کیں میں چھوٹا تھا اور آواز لگانے میں شرم کی وجہ سے اناڑی بھی ثابت ہوا' کوئی کتاب فروخت نہ کرسکا مگر والد صاحبؒ نے چار آنے فی روپیہ کے حساب سے جتنا انعام بھائی صاحب کو دیا اتنا ہی مجھے بھی عطاء فرمایا۔

ایک اور واقعہ

غرض ان تمام حالات میں بھی ہمیں مالی تنگی کا کبھی احساس نہ ہونے دیا۔ صرف ایک واقعہ سے اس کا پہلی بار اندازہ ہوا۔

گھر میں تقریباً ایک ہفتے سے خلاف معمول دونوں وقت دال پک رہی تھی' برادر

بزرگوار جناب محمد ولی رازی صاحب اور میں جیکب لائن کے مکتب میں قرآن شریف حفظ کرتے تھے، دوپہر کے وقفے میں کھانا کھانے گھر آئے تو اس وقت بھی دال تھی ہم نے والدہ صاحبہ سے شکایت کی "آپ روز ہی دال پکالیتی ہیں ہم سے کھائی نہیں جاتی" اس پر اچانک والدہ صاحبہ نے قدرے ناگواری سے فرمایا "گھر کا خرچ کس طرح چل رہا ہے تمہیں اس کی بھی کچھ خبر ہے؟ تم یہ نہیں سوچتے کہ تمہارے والد کا عرصہ سے کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے" یہ سن کر بچپن کے دل کو دھچکا سا لگا اور مالداری کے پندار نے دم توڑ دیا۔ پھر عرصہ دراز تک والد صاحب سے کوئی فرمائش کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اس زمانہ میں برادر بزرگوار جناب محمد رضی صاحب عثمانی کی عمر تقریباً سترہ سال تھی اور یہاں ہم چاروں بھائیوں میں وہ سب سے بڑے تھے انھیں والد صاحب نے مجبوراً مختلف چھوٹی چھوٹی تجارتوں میں لگایا مگر ہر تجارت کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی کسی تجارت میں کامیابی نہ ہوئی بعض میں تو نقصان اٹھانا پڑا۔

اس وقت کے وزیر اعظم خان لیاقت علی خاں مرحوم اور کابینہ کے بیشتر وزراء سے بڑی حد تک بے تکلفانہ مراسم تھے، قرارداد مقاصد اور اسلامی دستور کے سلسلہ میں آئے دن ملاقاتوں اور دعوتوں کا سلسلہ رہتا تھا مگر انھیں بھی کبھی کانوں کان اپنے معاشی حالات کی خبر نہ ہونے دی۔

یہ تھے وہ حالات جن میں پاکستان میں اسلامی نظام کی بنیاد رکھی جارہی تھی اور قرارداد مقاصد کا تاریخی کارنامہ انجام پارہا تھا۔

بورڈ آف تعلیمات اسلام کی رکنیت

پھر جب ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی نے باقاعدہ آئین سازی کا کام شروع کیا تو قائد ملت لیاقت علی خان مرحوم نے ایک "اسلامی مشاورتی بورڈ" بنایا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسلامی دستور کا خاکہ تیار کر کے پیش کرے اور اسکی روشنی میں دستور ساز اسمبلی پاکستان کا آئین تیار کرے۔ یہ بورڈ مندرجہ ذیل چھ حضرات پر مشتمل تھا۔

۱۔ حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔ صدر

۲۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ رکن

۳۔ جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (سابق استاد جامعہ عثمانیہ دکن جواب پیرس میں مقیم ہیں) رکن

۴۔ جناب پروفیسر عبد الخالق صاحب (مشرقی پاکستان) رکن

۵۔ مولانا جعفر حسین صاحب مجتہد (شیعہ عالم) رکن

۶۔ جناب ظفر احمد صاحب انصاری۔ سیکریٹری

مگر علامہ سید سلیمان صاحب ندوی اس وقت تک ہندوستان میں تھے پھر پاکستان تشریف لانے کے بھی کافی عرصہ بعد ۱۹۵۲ء میں آپ نے عہدۂ صدارت سنبھالا اس وقت تک یہ بورڈ صدر کے بغیر ہی اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔

یہ بورڈ ۹ اگست ۱۹۴۹ء سے اپریل ۱۹۵۴ء تک تقریباً ساڑھے چار سال قائم رہا۔ اور حضرت والد صاحبؒ شروع سے آخر تک اسکے ممتاز رکن رہے۔ اس بورڈ نے نہایت عرق ریزی کے بعد دستور پاکستان کے لئے جو سفارشات پیش کی تھیں، اگرچہ ۵۶ء و ۱۹۷۳ء کے دستوروں میں ان کی جھلک کسی حد تک موجود تھی لیکن افسوس کہ اس بورڈ کی تمام سفارشات کسی بھی دور کے آئین میں نہ تو تمام کی تمام روبہ عمل لائی گئیں نہ انھیں ارباب حل وعقد نے شائع کیا۔

استغناء اور بے باکی

اس بورڈ کے ممبران کو ایک ہزار روپے ماہوار اعزازی الاؤنس ملتا تھا جسے حضرت والد صاحبؒ نے اس شرط کے ساتھ قبول فرمایا تھا کہ وہ پابندیاں قبول نہ کریں گے جو سرکاری ملازمین کی ہوتی ہیں۔ یہ پیش بندی اس لئے فرمائی تھی کہ کلمہ حق کے اظہار میں ادنیٰ رکاوٹ پیش نہ آئے۔

چنانچہ ایک موقع پر جب اس بورڈ کی سفارشات کو بالکلیہ نظرانداز کر کے خالص مغربی طرز کے دستور کا مسودہ حکومت نے شائع کیا اور دو مرکزی وزیروں نے اپنے اخباری بیان میں اس مسودہ کو "بالکل اسلامی" قرار دیا تو حضرت والد صاحبؒ اور دیگر بعض ارکان نے ایک مشترکہ بیان شائع کیا جس میں واضح کیا گیا کہ اس مسودہ دستور کو ہماری سفارشات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اور جن وزیروں نے اسے اسلامی قرار دیا تھا بیان میں ان کی بھی خبر

لی گئی۔

اس وقت جو صاحب اسمبلی کے سیکریٹری تھے انہوں نے کسی زمانہ میں ہندوستان میں والد صاحبؒ سے کچھ دن عربی زبان سیکھی تھی۔ تعلقات میں قدرے بے تکلفی کے باعث انھوں نے حضرت والد صاحبؒ سے کہا کہ آپ کو حکومت کے اندر رہتے ہوئے ایسا بیان جاری کرنا مناسب نہ تھا۔ حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا

"جب سے میں نے بورڈ کی رکنیت قبول کی تھی اسی دن سے جیب میں استعفا لئے پھرتا ہوں اور وجہ یہ ہے کہ آپ کو تو اپنے سوٹ کی شان و شوکت برقرار رکھنے کیلئے سرکاری تنخواہ کی ضرورت ہے، میرے سر سے لیکر پاؤں تک کا لباس صرف بیس روپے میں بن جاتا ہے اس کیلئے مجھے ایک ہزار روپے کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔ میں آئندہ بھی جب جو بات مناسب سمجھوں گا بلا روک ٹوک شائع کروں گا ورنہ میرا استعفا ارباب حل وعقد تک پہنچا دیا جائے"۔

سیکریٹری صاحب نے معذرت کی اور آئندہ کسی کو ایسے اعتراض کی جرأت نہ ہوئی۔

لاء کمیشن کی رکنیت

بورڈ آف تعلیمات اسلام کا تعلق تو صرف دستور کی حد تک تھا۔ پاکستان کے موجودہ قوانین سے اس کا تعلق نہ تھا، موجودہ قوانین کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کے لئے علامہ سید سلیمان صاحب ندویؒ نے حکومت پر زور دیا تو ۱۹۵۰ء کے اواخر میں ایک لاء کمیشن بنایا گیا جس میں علماء کرام میں سے ابتداءً صرف علامہ سید سلیمان صاحب ندویؒ کو ممبر بنایا گیا۔ جسٹس رشید اور جسٹس میمن ماہر قانون کی حیثیت سے شریک کیے گئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ کی وفات کئی ماہ قبل ہو چکی تھی جو حضرت والدؒ کے استاد بھی تھے اور پھوپی زاد بھائی بھی۔[1]

حضرت سید صاحب نے محسوس فرمایا کہ اسلامی قانون کے ماہر کی حیثیت سے لاء کمیشن میں حضرت مفتی صاحبؒ کی شرکت ناگزیر ہے، انھوں نے لاء کمیشن میں اپنی شرکت باقی رکھنے کے لئے حکومت کے سامنے یہ شرط رکھ دی کہ مفتی صاحبؒ کو بھی کمیشن کا

---

[1] تمہید تفسیر معارف القرآن ص ۶۲ ج اول

رکن بنایا جائے۔ بالآخر آپ کو اس کی بھی رکنیت قبول کرنی پڑی۔

یہ کمیشن دو سال تک قائم رہا لیکن وزارتوں کے تغیر' اور برسراقتدار طبقہ میں کئی ایسے افراد کی طرف سے مسلسل رکاوٹوں کے باعث جو اس ملک میں اسلامی نظام دیکھنے کے روادار نہ تھے' اس کمیشن کی مساعی کوئی نتیجہ پیدا نہ کرسکیں۔

ایک موقع پر اس کمیشن کی ایک میٹنگ میں حضرت والد صاحبؒ نے کمیشن کے چیرمین کو جو ایک جسٹس تھے مخاطب کر کے فرمایا:

"قانون سازی کے کام کو اسلام کے رُخ پر آپ چلنے نہیں دیتے اور غلط رخ پر میں چلنے نہیں دوں گا، نتیجہ یہ ہو گا کہ گاڑی یہیں کھڑی رہے گی۔"

چنانچہ یہی ہوا، گاڑی کھڑی رہی۔

زکوٰۃ کمیٹی میں شرکت

تقریباً اسی زمانے میں حکومت پاکستان نے زکوٰۃ کی وصولیابی اور اس کے مصارف وغیرہ کے اسلامی قوانین مدوّن کرنے کے لئے "زکوٰۃ کمیٹی" قائم کی تھی۔

حضرت والد صاحبؒ اس کے بھی اول سے آخر تک رکن رہے لیکن اس میں بھی صورتحال وہی پیش آئی جو لاء کمیشن میں پیش آئی تھی۔

دینی غیرت وحمیت

ایک مرکزی وزیر خزانہ نے جن کا انتقال ہو چکا ہے' اسی کمیٹی کے سلسلہ میں شریعت کے کسی حکم کے متعلق کچھ توہین آمیز باتیں کہیں' جس پر حضرت والد صاحبؒ کی ان سے شدید جھڑپ ہو گئی' اس کے بعد والد صاحبؒ نے طے کر لیا تھا کہ آئندہ اس کا منہ نہ دیکھوں گا۔ چنانچہ جب وزیر موصوف پاکستان کے گورنر جنرل بن گئے تو والد صاحبؒ دعا اور کوشش کرتے تھے کہ کہیں آمنا سامنا نہ ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

درس قرآن حکیم

۱۳۷۰ھ '۱۹۵۰ء میں جبکہ رہائش آرام باغ کے پاس اقبال منزل میں تھی۔ حضرت

والد صاحبؒ نے مسجد باب الاسلام میں عام فہم درس قرآن کریم کا سلسلہ شروع فرمایا جو روزانہ بعد نماز فجر ایک گھنٹہ کے عمل سے سات سال میں پورا ہوا۔ ابھی پورے قرآن شریف کا درس مکمل نہ ہوا تھا کہ آپ اپنے ذاتی مکان "اشرف منزل" متصل لسبیلہ چوک میں منتقل ہوگئے اور ضعف کے باوجود دو سال تک وہیں سے روزانہ مسجد باب الاسلام آکر پابندی سے درس دیتے رہے۔ بیشتر آمد و رفت بس کے ذریعے ہوا کرتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اس درس کو ایسی مقبولیت عطا فرمائی کہ لوگ دس دس میل سے آکر پابندی سے شریک ہوتے تھے' اس درس نے شرکاء پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ انکی زندگیوں میں خوشگوار دینی انقلاب کا ناچیز نے خود مشاہدہ کیا۔

چیلنج کا جواب...... دستور قرآنی

جب درس قرآن کا یہ سلسلہ جاری تھا اور آپ بورڈ آف تعلیمات اسلام کے رکن بھی تھے اس زمانہ میں ایک مشہور ماہر قانون نے جو بعد میں کئی بار مرکزی وزیر بنے اپنے ایک اخباری بیان میں یہ دعویٰ کیا کہ علماء خواہ مخواہ اسلامی دستور کا مطالبہ کرتے ہیں' حالانکہ قرآن میں دستور کی ایک دفعہ بھی موجود نہیں اور علماء دین دستور کی ایک دفعہ بھی قرآن سے ثابت کردیں تو میں ان کو انعام پیش کروں گا۔

اللہ تعالیٰ نے اس دعوے کی رسوائی کا یہ انتظام فرمایا کہ انہی دنوں (یعنی ۳۰ شوال ۷۲ ۱۳ھ ۱۲ جولائی ۱۹۵۳ء) کے درس قرآن میں سورہ نساء کی یہ آیت آگئی۔

"اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ۔" (سورۂ نساء آیت: ۵۸)

جس کا اسلامی دستور سے گہرا تعلق ہے۔ حضرت والد صاحبؒ نے اس روز کے درس قرآن میں اس آیت کے علاوہ مزید اٹھائیس آیات کی تفسیر بھی بیان فرمائی جن سے دستوری مسائل نکلتے ہیں۔

اس درس میں آپ نے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ الخ کی ایک آیت کے صرف نصف حصہ سے اسلامی مملکت کی ۶ دستوری دفعات ثابت کیں اور کل ۲۹ آیات کے مجموعہ سے ۱۸ دفعات کا استنباط فرمایا۔ اس روز کے درس کا پہلے سے اخبار میں اعلان کیا گیا تھا جس کے باعث اجتماع بہت بڑا ہوگیا۔ خاص طور پر علماء کرام اور وکلاء کی بہت بڑی تعداد شریک درس تھی۔

اہل علم کی فرمائش پر یہ تقریر کتابی شکل میں "دستور قرآنی" کے نام سے شائع ہوئی پھر اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا' اس کتاب نے قرآن میں دستور کی نفی کرنے والوں کا منہ ہمیشہ کے لئے بند کردیا اور ثابت کردیا کہ جس دستور اسلامی کا مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے کیا جارہا ہے وہ صرف علماء و فقہاء کے اجتہاد و قیاس پر مبنی نہیں بلکہ قرآن حکیم میں موجود ہے۔

سرکاری "دارالعلوم کمیٹی" کی رکنیت

حکومت پاکستان نے قائداعظم مرحوم کی تین یادگاریں قائم کرنے کا پروگرام بنایا تھا (۱) ان کا مزار (۲) ایک جامع مسجد (۳) ایک دینی دارالعلوم' دارالعلوم قائم کرنے کے لئے جو کمیٹی سردار عبدالرب نشتر صاحب گورنر پنجاب کی قیادت میں بنی تھی' اس کے بھی آپ اوّل سے آخر تک اس امید پر رکن رہے کہ شاید پاکستان میں اسلامی نظام تعلیم کے لئے اسے ایک نمونہ کی درس گاہ بنایا جاسکے۔ نصاب میں بڑی عرق ریزی سے موجودہ زمانے کی ضروریات کو سمویا گیا' اس کے لئے جگہ کا انتخاب بھی کرلیا گیا تھا۔ مگر دوسرے بہت سے دینی منصوبوں کی طرح یہ بھی بعد کی حکومتوں کے بار بار انقلاب کی نذر ہوگیا۔

مرکزی جمعیتہ علمائے اسلام کی قیادت

۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نور اللہ مرقدہ کی وفات کے بعد حضرت علامہ سید سلیمان ندوی صاحب قدس سرہ جمعیتہ علمائے اسلام کے صدر منتخب ہوئے۔ لیکن ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء میں حضرت سید صاحبؒ کی وفات کے بعد جہاں دستوری مساعی کی دوسری ذمہ داریاں والد صاحبؒ کے کاندھوں پر آپڑیں اسی کے ساتھ جمعیتہ علمائے اسلام کی صدارت بھی آپ کو سونپ دی گئی لیکن یہ وہ وقت تھا جب مغربی پاکستان میں ایک اور جمعیت اسی نام سے قائم ہو چکی تھی جس کا مرکزی جمعیت سے کوئی رابطہ نہ تھا' حضرت والد صاحبؒ نے اسلامی دستور کی جدوجہد کے ساتھ ہی شب و روز کی مساعی سے ان منتشر جماعتوں کو مرکز سے مربوط کیا اور حکیم الامت حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ خاص

حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ (بانی جامعہ اشرفیہ لاہور) نے اس شرط پر صدارت قبول فرمائی کہ جمعیۃ کی ذمہ داری کا تمام کام حضرت مفتی محمد شفیع صاحب انجام دیں اور اس مقصد کے لئے والد صاحبؒ کو جمعیۃ کا قائم مقام صدر بنا دیا گیا۔

جتنے سرکاری اداروں میں آپ بحیثیت ممبر شریک ہوئے۔ ان سب میں آپ نے اپنی شرکت کی یہ شرط ارباب حل و عقد سے ہمیشہ منوائی کہ ہم پر عوامی تقریر و تحریر کی وہ پابندیاں عائد نہیں ہوں گی' جو سرکاری ملازمین پر ہوتی ہیں۔ چنانچہ صدارت جمعیۃ علمائے اسلام سے پہلے اور بعد میں آپ نے جمعیۃ کی جانب سے تحریک دستور اسلامی کے لئے مشرقی و مغربی پاکستان کے طول و عرض کے بار بار دورے کئے اور ضلع ضلع میں پہنچ کر اسلامی دستور کے لئے عوامی شعور کو بیدار کیا۔ مغربی پاکستان کا ایک دورہ جو ۱۸ دسمبر ۱۹۵۵ء سے ۳ جنوری ۱۹۵٦ء تک جاری رہا' اس میں ناچیز راقم الحروف اور برادر عزیز مولانا محمد تقی صاحب عثمانی کو بھی شرف ہمرکابی حاصل ہوا۔

قائم مقام صدر جمعیۃ علمائے اسلام کی حیثیت سے آپ نے تقریباً ۳ سال تک جمعیۃ کی خدمات انجام دیں۔ آپ کی مساعی جاری تھیں کہ ملک میں انقلاب آیا اور جنرل محمد ایوب خان مرحوم نے مارشل لاء لگا کر تمام جماعتوں کو کالعدم قرار دے دیا، مارشل لاء کے دوران حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ صدر جمعیۃ علماء اسلام بھی رحلت فرما گئے۔

پھر جب مارشل لاء ہٹا اور جماعتیں دوبارہ منظم ہوئیں تو "جمعیۃ علماء اسلام" کے نام سے بعض علماء کرام نے ایک نئی تنظیم قائم فرمائی' اس لئے حضرت والد صاحبؒ اصل "جمعیۃ علماء اسلام" کی تنظیم جدید کرنے سے باز رہے تاکہ علماء کرام کے مابین تفرقہ پیدا نہ ہو، لیکن پاکستان میں اسلامی نظام کے لئے انفرادی طور پر علمی و عملی میدانوں میں کوشش فرماتے رہے جس کی تفصیل بہت زیادہ ہے اس مقالہ میں اسکی گنجائش نہیں۔

مگر ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے کچھ پہلے سیاسی ہنگاموں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ پاکستان میں خالص اسلامی حکومت کے بجائے کمیونزم اور سوشلزم پھیل جانے کے خطرات قوی ہو گئے اور سوشلزم کو عین اسلام باور کرانے کے لئے پروپیگنڈا اور جلسے جلوس عام ہو گئے تو اس مسئلہ کی نزاکت نے پھر آپ کو اصل "جمعیۃ علماء اسلام" کے احیاء پر مجبور کر دیا۔ کیونکہ ضابطہ میں قائم مقام صدر آپ ہی تھے۔

چنانچہ مغربی و مشرقی پاکستان کے تمام ارکان جمعیت کا اجلاس بلا کر جمعیت کی صدارت تو حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کی طرف منتقل فرمادی اور خود کسی عہدے کے بغیر مرکزی جمعیت علماء اسلام کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ اسلام اور سوشلزم کے درمیان جو بنیادی خلیج حائل ہے اسے تحریر و تقریر کے ذریعے واضح فرمایا۔ آپ نے ایک رسالہ "اسلام کا نظام تقسیم دولت" اور دوسرا رسالہ "اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات کیا ہوں گی" اسی دور میں تصنیف فرمائے جو کثیر تعداد میں شائع ہوئے۔ تقریباً ایک سال اس جدوجہد میں صرف ہوا جس سے مسئلہ کی وضاحت تو بحمد اللہ پوری طرح ہو گئی مگر سیاست کے میدان میں مسائل اور حقائق سے زیادہ زور و زر کام کرتے ہیں' انتخابات کا نتیجہ بالکل برعکس نکلا اور اس کے اثرات سے پاکستان پر جو زوال آنا تھا' آگیا۔

ریڈیو سے درس معارف القرآن

۱۹۵۴ء میں ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل جناب ذوالفقار علی بخاری نے حضرت والد صاحبؒ سے باصرار درخواست کی کہ ریڈیو پاکستان سے قومی پروگرام میں جو درس قرآن روزانہ نشر ہوتا ہے وہ آپ دیا کریں مگر آپ نے یہ درخواست چند اعذار کی بناء پر قبول نہ فرمائی' پھر انہوں نے ایک دوسری تجویز پیش کی کہ یومیہ درس کے سلسلہ سے الگ ایک ہفتہ واری درس بنام "معارف القرآن" جاری کیا جائے جس میں پورے قرآن کی تفسیر پیش نظر نہ ہو بلکہ عام مسلمانوں کی موجودہ ضروریات کے لحاظ سے خاص خاص آیات کا انتخاب کر کے ان کی تفسیر اور متعلقہ احکام بیان کئے جائے۔ والد صاحبؒ نے یہ تجویز اس شرط کے ساتھ قبول فرمائی کہ درس کا کوئی معاوضہ نہ لوں گا اور کسی ایسی پابندی کو بھی قبول نہ کروں گا جو میرے نزدیک درس قرآن کے مناسب نہ ہو' یہ شرط منظور کرلی گئی۔

۳ شوال ۷۳ ۱۳ھ/۲ جولائی ۱۹۵۴ء سے درس معارف القرآن شروع ہوا اور قومی پروگرام میں تقریباً گیارہ سال پابندی سے نشر ہوتا رہا۔ جب یہ درس شروع ہوا تو پاکستان کے سب علاقوں سے اور ان سے بھی زیادہ بیرونی ممالک افریقہ و یورپ وغیرہ میں بسنے والے مسلمانوں کی طرف سے بیشمار خطوط ریڈیو پاکستان کو اور خود والد صاحبؒ کو وصول ہوئے' جن سے معلوم ہوا کہ بے شمار دین دار اور نو تعلیم یافتہ مسلمان اس درس کو نہایت اہتمام

سے سنتے ہیں' افریقہ میں چونکہ یہ درس آخر شب یا بالکل صبح صادق کے وقت سنا جاتا تھا وہاں کے لوگوں نے اس کو ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ محفوظ کر کے بعد میں سب کو بار بار سنانے کا انتظام کر لیا تھا[1]۔ درس کی اسی مقبولیت کے پیش نظر پاکستان کے دوسرے ریڈیو اسٹیشن کوئٹہ وغیرہ اسے دوسرے اوقات میں بھی نشر کرتے تھے اور کچھ عرصہ بعد اس کا سندھی ترجمہ حیدر آباد سے نشر کیا جانے لگا۔

ریڈیو کے ضابطہ کے مطابق اس زمانہ میں ایک درس کا معاوضہ تیس روپے مقرر تھا جس کی گیارہ سال کی مجموعی رقم اُس زمانہ کی تقریباً سولہ ہزار روپے ہوتی ہے لیکن آپ نے با اختیار افسران کے اصرار کے باوجود اس میں سے ایک پیسہ بھی کبھی قبول نہیں فرمایا۔ محض لوجہ اللہ یہ خدمت جاری رکھی' یہاں تک کہ جب یہ درس تیرہویں پارے کی سورہ ابراہیم تک پہنچا تو ریڈیو پاکستان کی نئی پالیسی کے تحت اسے بند کر دیا گیا۔

یہی وہ بابرکت درس معارف القرآن ہے جو حضرت والد صاحبؒ کی شہرہ آفاق تفسیر معارف القرآن کی بنیاد بنا۔

عظیم پائیدار کارنامہ.... تاسیس دارالعلوم کراچی

ہجرت پاکستان کے بعد حضرت والد صاحبؒ نے دو کاموں کو اپنا مقصد زندگی بنا لیا تھا۔ ایک پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے جدوجہد' دوسرے کراچی میں یہاں کے شایان شان دارالعلوم کا قیام۔

ابتدائی دو سال تو قرارداد مقاصد اور اسلامی دستور کی جدوجہد جو انتہائی بے سروسامانی میں ہو رہی تھی اسی کی مشغولیت اتنی رہی کہ دارالعلوم کے قیام میں کامیابی نہ ہو سکی۔

فتاویٰ کا مشغلہ دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہونے کے بعد بھی آپ کا جزو زندگی بنا رہا مگر اس عرصہ میں جو فتاویٰ لکھے گئے وہ کسی رجسٹر میں نقل کئے بغیر ہی روانہ کر دیئے جاتے تھے' نقل کا کوئی انتظام نہ تھا' البتہ نہایت اہم اور منتخب فتاویٰ آپ خود ہی ایک رجسٹر میں نقل فرما لیا کرتے تھے۔

---

[1] یہ بات احقر کو ٹانگانیکا کے ایک مسلم افریقی باشندے نے بھی بتائی تھی (رفیع)

جیکب لائن سے آپ کی رہائش آرام باغ کے قریب ایک کرایہ کے مکان میں منتقل ہوئی تو مسجد باب الاسلام کے احاطہ میں دروازہ کے اوپر آپ نے ایک کمرہ دارالافتاء کا تعمیر کرایا' تاکہ فتویٰ حاصل کرنے والوں کو سہولت ہو' نقل فتاویٰ اور دارالافتاء کے انتظام کے لئے ایک صاحب کو تنخواہ پر رکھ لیا اور فارسی و عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کے لئے احقر کے استاد محترم حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی اور حضرت مولانا امیر الزماں صاحب کشمیری کو مقرر فرمایا' یہ دونوں حضرات والد ماجدؒ کے شاگرد ہیں' اسی سال احقر کے حفظ قرآن کی تکمیل ہوئی تھی' دوسرے چند طلبہ کے ساتھ برادر عزیز مولانا محمد تقی صاحب عثمانی اور ناچیز راقم الحروف نے فارسی کی ابتدائی کتابیں یہیں پڑھنی شروع کیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرمائے کہ محلہ نانک واڑہ میں انگریزوں کے زمانہ کے سکھوں کے ایک اسکول کی خالی عمارت دارالعلوم کیلئے عطا فرمادی' حضرت والد صاحبؒ نے ہمارے بہنوئی جناب مولانا نور احمد صاحب کو ساتھ لے کر چندے کی اپیل یا سازوسامان کے بغیر نہایت سادگی سے اس عمارت میں مدرسہ قائم فرمادیا' ایک استاد اور چند طلبہ سے اس مدرسہ کا محض اللہ کے بھروسہ پر آغاز ہوا۔ اس وقت تک کراچی میں مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کے سوا کوئی مدرسہ نہ تھا' بلکہ پورے پاکستان میں گنے چنے ہی مدارس تھے' علوم دینیہ کے طلبہ پریشان تھے۔ یہ مدرسہ کھلا تو ملک کے اطراف واکناف سے طلبہ آنے شروع ہوگئے اور چند مہینے کے اندر اندر یہی مدرسہ "دارالعلوم کراچی" بن گیا۔ اب دارالافتاء بھی یہیں منتقل ہو گیا' حضرت والد صاحبؒ کا جو وقت دستوری جدوجہد سے بچتا تھا وہ درس و فتویٰ اور دارالعلوم کی انتظامی نگرانی میں یہیں صرف فرمانے لگے۔ حضرت والد صاحبؒ دارالعلوم کے صدر تھے اور آخر تک صدر رہے' جناب مولانا نور احمد صاحب دارالعلوم کے سب سے پہلے ناظم تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیتیں عطاء فرمائی ہیں وہ نہایت جانفشانی سے دارالعلوم کا انتظام کئی سال تک چلاتے رہے۔

دارالعلوم کے ہر شعبہ میں کام جس تیز رفتاری سے بڑھ رہا تھا' اس کے سامنے موجودہ عمارت بہت تنگ محسوس ہونے لگی' ادھر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کی وفات کے بعد حضرت والد صاحبؒ کی دلی تمنا تھی کہ ان کی یادگار کے طور پر ان کے شایان شان دارالعلوم قائم ہو' اس کے لئے وہ احاطہ زمین جس میں شیخ الاسلامؒ کا مزار ہے' شب وروز کی

جدوجہد سے باضابطہ حاصل فرمایا اور دارالعلوم کو وہیں منتقل کرنے کے خیال سے نقشہ منظور کرا کے تعمیر کا کام شروع کر دیا، مگر بعض لوگوں کی مزاحمت کے باعث کھدی ہوئی بنیادیں اسی حال میں محض جھگڑا ختم کرنے کے لیے چھوڑ کر واپس نانک واڑہ تشریف لے آئے۔ حکومت نے اور رفقاء کار نے بہت زور دیا کہ تعمیر جاری رکھی جائے مگر حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ

"دارالعلوم بنانا فرض کفایہ اور مسلمانوں کو جھگڑے سے بچانا فرض عین ہے، فرض عین کو چھوڑ کر فرض کفایہ میں لگنا دین کی صحیح خدمت نہیں، میں جھگڑا مول لے کر یہاں ہرگز دارالعلوم نہ بناؤں گا۔"

تھوڑے ہی عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے کورنگی میں والد صاحبؒ کو چھپن ایکڑ زمین دارالعلوم کے لئے عطاء فرمادی تو جدید تعمیرات بقدر ضرورت مکمل ہو جانے کے بعد دارالعلوم یہاں منتقل فرمادیا اور نانک واڑہ کی عمارت میں دارالعلوم کے چند شعبے رہ گئے۔

بورڈ آف تعلیمات اسلام کی رکنیت سے فارغ ہو جانے کے بعد آپ کی مصروفیات دارالعلوم میں بڑھتی چلی گئیں، پھر جب جنرل محمد ایوب خاں کی حکومت آئی اور عوامی سطح پر اسلامی دستور و قانون کے لئے جدوجہد کے راستے مسدود ہو گئے تو آپ کی تمام تر توجہات کا مرکز یہی دارالعلوم بن گیا۔ اور لسبیلہ چوک کے پاس اپنا ذاتی کشادہ مکان جو نہایت شوق و محنت سے کتنی ہی تکلیفیں جھیل کر اپنی ضروریات کے مطابق تعمیر کیا تھا اسے چھوڑ کر مستقل رہائش دارالعلوم کے احاطہ کورنگی ہی میں اختیار فرمالی اور یہاں کئی سال تک کھپریل کی چھت کے صرف دو کمروں میں گزارا فرمایا، زندگی کے آخری لمحات تک درس و فتویٰ اصلاح و ارشاد اور انتظام دارالعلوم میں مشغولیت رہی۔ احاطہ دارالعلوم کے اسی مکان میں وفات پائی۔ اور احاطۂ دارالعلوم ہی کے قبرستان میں اب محو آرام ہیں، ناریل کے ان درختوں کے سایہ تلے جو پندرہ سال قبل خود کھڑے ہو کر لگائے تھے۔

دارالعلوم کی ان تمام خدمات کا ابتدائی چار سال تک تو آپ نے کوئی معاوضہ لیا ہی نہیں، پھر جب بورڈ آف تعلیمات اسلام کی رکنیت ختم ہو گئی، کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اور دارالعلوم کی خدمات شب و روز کا مشغلہ بنی ہوئی تھیں تو جمادی الاولی ۱۳۷۴ھ - ۲۷ دسمبر ۱۹۵۴ء سے مجلس منتظمہ کی درخواست پر پانچ سو روپے مشاہرہ لینا منظور فرمالیا مگر شعبان ۱۳۷۷ھ سے اس مشاہرہ میں از خود کمی کر کے صرف تین سو روپے ماہوار باقی رکھے جس کا

اکثر حصہ دارالعلوم ہی کی ضروریات' ٹیلیفون' آمدورفت' اور مہمانداری میں خرچ ہو جاتا تھا پھر ۱۳۸۴ھ سے یہ تین سو روپے لینا بھی ترک فرما دیا۔

اس عرصہ میں جتنی رقم دارالعلوم سے بہ طور مشاہرہ وصول کی تھی' والد صاحب کی خواہش تھی کہ اس کو بتدریج واپس فرمادیں' چنانچہ متفرق اوقات میں مختلف عنوانات سے تقریباً ساڑھے بیالیس ہزار روپے دارالعلوم میں داخل فرمائے جس کی تفصیل درج ذیل ہے[1]

۱۔ دارالعلوم کی جامع مسجد (کورنگی) میں توسیع کے لئے ۵۰۰۰ر

۲۔ ۱۳۹۲/۶/۱۷ھ تک کتابیں اور دیگر سامان دارالعلوم کو دیا جس کی مالیت پانچ ہزار تھی۔ ۵۰۰۰ر

۳۔ تاریخ مذکور تک مختلف اوقات میں مزید نقد دیئے تقریباً ۴۰۰۰ر

۴۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کے پانچ سو نسخے دارالعلوم کو نصف قیمت پر عنایت فرمائے' نصف قیمت خود برداشت کی جو دس ہزار روپے تھی ۱۰۰۰۰ر

۵۔ تقریباً ۱۳۹۳ھ میں باقاعدہ رسید لے کر دارالعلوم کو نقد دیئے ۵۰۰۰ر

۶۔ ۱۳۹۴ھ میں دارالعلوم (کورنگی) کی جامع مسجد کے مصارف کے لئے دو کمرے احاطہ دارالعلوم میں اپنے خرچ پر تعمیر کرا کے وقف فرمائے۔

جس کا خرچ آیا۔ ۱۳۲۸۵٫۹۳ر

میزان......... ۴۲۲۸۵٫۹۳ر

حضرت والد صاحبؒ کی اسی للّٰہیت کا یہ ثمرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دارالعلوم کو دنیا کے عظیم دینی مدارس کی صف میں لا کھڑا کیا اور پاکستان کے عظیم ترین دینی اداروں میں اسے ممتاز مقام حاصل ہے دارالعلوم اور دین کے مختلف شعبوں میں اس کی عظیم الشان خدمات حضرت والد صاحبؒ کا ایسا صدقہ جاریہ ہے جو انشاء اللہ صدیوں باقی رہے گا۔

دارالعلوم کی مفصل تاریخ' اس کی خدمات کا جائزہ اور اس کے مختلف شعبوں کا

---

[1] یہ سب تفصیل حضرت والد صاحبؒ کی ذاتی قلمی بیاض "کتاب المنن والمحن" ص ۲۰۰ سے لی گئی ہے۔

تعارف اتنا بڑا کام ہے کہ اس کے لئے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ یہ مقالہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

اس دور میں خدمت فتویٰ

فتویٰ کی عظیم ذمہ داریاں جو ۳۵ سال کی عمر سے جزو زندگی بنی ہوئی تھیں۔ اس آخری دور میں اور زیادہ ہمہ گیر ہو گئیں۔ دنیا بھر کے ممالک سے فقہی سوالات کا تانتا بندھا رہتا تھا' جن مسائل میں علماء محققین کا اختلاف ہوتا وہ بھی محاکمہ کے لئے والد صاحبؒ ہی کے پاس آتے تھے۔ روزانہ کی ڈاک میں فتاویٰ کے علاوہ آپ کے مریدین و خلفاء اعزہ و احباب اور ملکی و غیر ملکی زعماء کے خطوط بھی بکثرت ہوتے تھے' آپ پوری ڈاک کا جواب روز کے روز لکھنے کے عادی تھے۔ البتہ بعض مسائل میں کتابوں کی مراجعت یا دوسرے علماء سے مشورے کے باعث کچھ تاخیر بھی ہو جاتی تھی۔

والد صاحبؒ کے لکھنے کی رفتار بہت تیز تھی' تصنیف ہو یا فتویٰ' مجھے کبھی یاد نہیں کہ ہاتھ میں قلم لئے سوچ رہے ہوں' شروع میں چند لمحے غور فرماتے پھر تیز رفتاری سے رکے بغیر لکھتے جاتے تھے۔ تیز چلتی ہوئی گاڑی میں بھی فتویٰ وغیرہ بے تکلف تحریر فرماتے رہتے' ریل کے بڑے بڑے سفر اسی مشغلہ میں طے ہوتے تھے۔

تعداد فتاویٰ

دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء سے آپ کے زمانہ میں چھتیس ہزار بیاسی فتاویٰ جاری ہوئے تھے (تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۹۹ تا ۱۰۰) اس کے بعد دارالعلوم کراچی کے قیام تک ہزاروں فتاویٰ تحریر فرمائے جن کی نقل محفوظ نہ کی جا سکی۔ صرف ۱۰۴ منتخب فتاویٰ آپ نے خود نقل فرمائے تھے جو امداد المفتین کا جزء بنا دیئے گئے ہیں۔ دارالعلوم کراچی میں ۱۸ شعبان ۷۰ھ سے آپ کی وفات تک کل ۷،۹۵۷ فتاویٰ کی نقل محفوظ کی گئی جو بیشتر آپ ہی کے تحریر فرمودہ ہیں اور جو فتاویٰ نائب مفتی صاحبان نے لکھے ان میں سے بھی اکثر پر آپ کے تصدیقی دستخط ہیں۔ اس طرح آپ کے جن فتاویٰ کی نقلیں دیوبند اور کراچی میں محفوظ ہیں'

صرف ان کی تعداد ستتر ہزار ایک سو چوالیس (۷۷،۱۴۴) ہے پھر یہ تفصیل صرف تحریری فتاویٰ کی ہے ' زبانی فتاویٰ کی تعداد یقیناً تحریری فتاویٰ سے کئی گنا زیادہ ہوگی ' کیونکہ ان کا سلسلہ تو ہر وقت ہی ملاقاتوں میں اور فون پر جاری رہتا تھا۔ سخت بیماری میں بلکہ رات کے ایک دو بجے بھی کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو بے وقت پوچھنے پر کبھی نرمی سے تنبیہہ تو فرما دیتے مگر جواب مستحضر ہوتا تو اگلے وقت پر نہ ٹالتے تھے۔

تربیت افتاء

۱۳۷۹ھ میں ناچیز راقم الحروف اور برادر عزیز مولانا محمد تقی صاحب عثمانی ' دار العلوم کراچی میں درس نظامی سے فارغ ہوئے تو حضرت والد صاحبؒ نے دار العلوم میں فتویٰ نویسی کی باقاعدہ تربیت دینے کا بھی ایک شعبہ " تخصص فی الافتاء " کے نام سے قائم فرمایا جو اب بھی قائم ہے۔ اس میں تربیت کا سب کام آپ خود ہی انجام دیتے تھے۔ نصاب دو سالہ تھا ' بہت سے علماء کرام کے علاوہ بحمد اللہ ہم دونوں بھائیوں کو بھی اس شعبہ میں دو سال زیر تربیت رہنے کی سعادت نصیب ہوئی ' اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً کچھ فتاویٰ ہم دونوں کو عنایت فرمادیتے تھے ' تاکہ مشق کا سلسلہ جاری رہے۔

دیوبند اور کراچی میں کم از کم ایک نائب مفتی ہمیشہ آپ کے زیر تربیت رہے جن کے لکھے ہوئے فتاویٰ آپ کی اصلاح و تصدیق کے بعد روانہ کئے جاتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ:

" فتویٰ کا خاص ذوق اور ملکہ ہوتا ہے جو مفتی میں ہونا ضروری ہے اور وہ کتنی ہی کتابیں پڑھنے کے باوجود اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک برسہا برس کسی ماہر مفتی کے زیر ہدایت فتویٰ لکھنے کا کام نہ کیا ہو۔ " وفات سے سات سال قبل ۱۳۹۰ھ میں آپ نے برادر عزیز مولانا محمد تقی صاحب کو تصنیف و تالیف کی خدمت پر مامور فرمایا جن کا شگفتہ قلم ماشاء اللہ والد صاحبؒ کے علوم کا بہترین ترجمان ثابت ہوا اور احقر کو فتویٰ کی خدمات پر بحیثیت نائب مفتی مقرر فرمایا۔ اپنی نا اہلی کے باوجود بحمد اللہ سات سال والد صاحبؒ کی تربیت اور دعاؤں کے سایہ میں اس خدمت میں لگے رہنے کا موقع نصیب ہوا ' یہ اور بات ہے کہ احقر اپنی شامت اعمال کے باعث کچھ حاصل نہ کرسکا۔

زندگی کے آخری چار سال میں طرح طرح کے شدید امراض کے باعث آپ بیشتر

فتاویٰ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب مدظلہم اور احقر سے لکھوایا کرتے تھے مگر بہت سے فتاویٰ روزانہ خود بھی لکھتے یا املاء کراتے رہے۔۔ یہاں تک کہ ۱۰ شوال ۱۳۹۶ھ۔۱۹۷۶ء کے دن قلب کے جس دورہ میں آپ کی وفات ہوئی' اس خوفناک دورہ سے ۱۵ منٹ قبل بھی ایک فتویٰ املا کرا کے اس پر دستخط فرمائے جس کا سلسلہ نمبر یہاں کے رجسٹر ۲۷ (ھ) میں ۴۰۹۵۸ ہے۔ یہی وہ فتویٰ تھا جس پر والد صاحبؒ کی مصروفیات کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

آپ کی تصانیف ایک نظر میں

حضرت والد صاحبؒ کی تصانیف اکثر اردو میں اور کئی عربی زبان میں ہیں۔ تصانیف کی کل تعداد ایک سو باسٹھ (۱۶۲) ہے۔ صرف فقہی موضوعات پر آپ کی پچانوے تصانیف ہیں' بہت سی تصانیف کا مفصل تعارف "البلاغ کے مفتیٔ اعظم نمبر میں خدمات اور کارنامے" والے حصہ میں متعدد اہل علم نے کرادیا ہے لیکن بہت سی تصانیف کا ذکر وہاں بھی نہیں آیا۔ لہٰذا سب تصانیف کی ایک مکمل فہرست یہاں مضمون وار پیش خدمت ہے تاکہ ایک نظر میں کم از کم ان کے ناموں سے واقفیت حاصل کی جاسکے۔

تفسیر :۔ (۱) تفسیر معارف القرآن کامل ۔ ۸ جلدوں میں، یہ ۵۷۱۷ صفحات پر مشتمل ہے (۲) احکام القرآن (عربی) دو جلدوں میں از سورہ شعراء تا سورہ حجرات جو باریک قلم کے ۵۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

حدیث :۔ (۳) تقریر ترمذی ۔ جو حضرت انور شاہ کشمیریؒ کے درس میں قلمبند فرمائی (غیر مطبوعہ) (۴) الازدیاد السنی علی الیانع الجنی (عربی) اکابر علماء دیوبند کا سلسلہ اسناد حدیث۔ (۵) مختصر چہل حدیث مترجم متعلقہ اخلاق و آداب (۶) چہل حدیث متعلقہ اسلامی معاشیات (غیر مطبوعہ) (۷) چرخے کی فضیلت۔ متعلقہ احادیث کا مجموعہ۔

فقہ :- (۸) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (امداد المفتین) جو ۱۰۸۶ صفحات پر مشتمل ہے (۹) اسلام کا نظام اراضی (۱۰) آلات جدیدہ 'نئی ایجادات کے شرعی احکام (۱۱) مسئلہ سود (۱۲) آداب المساجد (۱۳) رفیق سفر۔ سفر سے متعلق شرعی احکام و آداب (۱۴) مسجد کے حدود کار اور آداب۔ یہ رسالہ مستقل تصنیف فرمایا تھا' بعد میں اسے معارف القرآن کا جز بنا دیا (۱۵) شب براءت (۱۶) احکام القمار (۱۷) تصویر کے شرعی احکام (۱۸) بیمہ زندگی (۱۹) حیلہ ناجزہ۔ یہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور والد ماجدؒ کی مشترک تصنیف ہے۔ (۲۰) نکاح و طلاق۔ یہ بھی آپ نے بعد میں معارف القرآن کا جزء بنا دیا (۲۱) اعضاء انسانی کی پیوند کاری (۲۲) پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود (۲۳) ضبط ولادت کی شرعی حیثیت (۲۴) احکام حج (۲۵) قرآن میں نظام زکوٰۃ (۲۶) احکام دعا (۲۷ تا ۷۱) جواہر الفقہ۔ دو جلدوں میں یہ آپ کے پینتالیس فقہی رسائل پر مشتمل ہے جن کا تعارف حضرت مولانا محمد اشرف خان صاحب نے البلاغ کے مفتی اعظم نمبر میں اپنے مقالے "حکیم الامتؒ کے علمی جانشین" میں کرا دیا ہے (۷۲ تا ۸۹) وہ اٹھارہ رسائل جو فتاویٰ دارالعلوم "امداد المفتین" کا جز بن کر شائع ہوئے ہیں' ان کا تعارف بھی موصوف کے مقالے میں موجود ہے۔ (۹۰ تا ۹۶) وہ سات فقہی رسائل جو عربی زبان میں احکام القرآن کا جز بن کر شائع ہو چکے ہیں' ان کا تعارف بھی موصوف نے اپنے مقالے میں کرایا ہے۔

عقائد و کلام :- (۹۷) ایمان و کفر قرآن کی روشنی میں (۹۸) مقام صحابہ (۹۹) صحابہ کرام میں افضل کون ہے؟ (۱۰۰) ختم نبوت کامل (۱۰۱) التصریح بما تواتر فی نزول المسیح (عربی) یہ کتاب حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ اور والد ماجدؒ کی مشترکہ تالیف ہے۔ (۱۰۲) ہدیۃ المہدیین فی آیات خاتم النبیین (عربی) (۱۰۳) مسیح موعود کی پہچان (۱۰۴) دعاوی مرزا (۱۰۵) ممالک اسلامیہ سے قادیانیوں کی غداری (۱۰۶) مشرق اور اسلام (۱۰۷) سنت و بدعت

معیشت و سیاست :- (۱۰۸) اسلام کا نظام تقسیم دولت (۱۰۹) اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات کیا ہوں گی؟ (۱۱۰) دستور قرآنی (۱۱۱) اسلامی ریاست میں غیر

مسلموں کے حقوق (۱۱۲) ووٹ اور ووٹر کی شرعی حیثیت (۱۱۳) سرمایہ داری، سوشلزم اور اسلام (۱۱۴) خطبہ صدارت کل ہند جمعیت علماء اسلام کانفرنس منعقدہ حیدر آباد سندھ جنوری ۷ ۱۹۴۷ء (۱۱۵) افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ (۱۱۶) جہاد پاکستان ۱۹۶۵ء (۱۱۷) حالیہ جنگ نے ہمیں کیا سبق دیئے (۱۱۸) وحدت امت (۱۱۹) أخلاف ام شقاق؟ (عربی) (۱۲۰) اسلام میں مشورے کی اہمیت (نامکمل)

سیرت و تاریخ : (۱۲۱) سیرت خاتم الانبیاء (۱۲۲) آداب النبی (۱۲۳) شہادت کائنات، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادتیں کائنات میں (۱۲۴) فتوح الہند (۱۲۵) شہید کربلا (۱۲۶) ذوالنون مصری (۱۲۷) دو شہید (۱۲۸) درس عبرت

اصلاح وارشاد : (۱۲۹) گناہ بے لذت (۱۳۰) گناہوں کا کفارہ (۱۳۱) بسم اللہ کے فضائل و مسائل (۱۳۲) روح تصوف (۱۳۳) دافع الافلاس (۱۳۴) مصیبت کے بعد راحت (۱۳۵) کید الشیطان۔ موت کے وقت مکر شیطانی اور بچاؤ کی تدبیریں (۱۳۶) رجوع الی اللہ (۱۳۷) ذکر اللہ اور درود و سلام کے فضائل (۱۳۸) آداب الشیخ والمرید (۱۳۹) خلاصہ و تسہیل قصد السبیل (۱۴۰) دل کی دنیا (۱۴۱) ملفوظات امام مالکؒ (۱۴۲) ملفوظات امام احمد بن حنبلؒ (۱۴۳) پیغمبر امن و سلامتؐ (۱۴۴) مقدمہ حیوۃ المسلمین۔

تعلیم و تبلیغ :۔ (۱۴۵) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ یہ کتاب ماہنامہ "القاسم" دیوبند میں قسط وار شائع ہوئی (۱۴۶) قرون اولیٰ میں مسلمانوں کا نظام تعلیم (۱۴۷) طلبہ کے نام دو اہم پیغام (۱۴۸) وصیت نامہ۔

زبان وادب :۔ (۱۴۹) اصول اللغۃ۔ مقدمہ المنجد اردو (۱۵۰) کشکول۔ اردو فارسی کلام۔ نظم و نثر (۱۵۱) نفحات۔ عربی نظم و نثر کا مجموعہ (۱۵۲) تحفۃ الوطن شرح نفحۃ الیمن (عربی)

متفرقات : ۔ (۱۵۳) اسلام میں نظام مساجد (۱۵۴) میرے والد ماجد اور ان کے مجرب عملیات (۱۵۵) نقوش و تاثرات۔ سفرنامہ دیوبند و تھانہ بھون (۱۵۶) مجالس حکیم الامت (۱۵۷) حضرت تھانویؒ کے آخر عمر کے ملفوظات جو خاتمۃ السوانح میں شائع ہوئے۔ (۱۵۸) مکاتیب حکیم الامت۔ (غیر مطبوعہ) (۱۵۹) دارالعلوم دیوبند اور اس کا مزاج و مذاق (۱۶۰) تاریخ قربانی (۱۶۱) مقدمہ امداد الفتاویٰ (۱۶۲) مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (عزیز الفتاویٰ)

○

اعتذار

حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ جیسی عظیم جامع شخصیت کی سوانح اتنا بڑا موضوع ہے کہ اس کے لئے کئی مستقل ضخیم تصانیف کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

حضرت کی زندگی کا کوئی پہلو بھی تو ایسا نظر نہیں آتا جو اپنے دامن میں عبرتوں اور ہدایتوں کے خزانے نہ رکھتا ہو مگر مجبوراً بیشمار حالات و واقعات بلکہ کئی مستقل موضوعات کو چھوڑتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔

۱۳۶۲ھ (تقریباً ۱۹۴۳ء) میں احقر کی عمر سات سال ہو چکی تھی۔ اس وقت سے آپ کی وفات تک کے حالات تو چشم دید ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اندرونِ ملک کے علاوہ سعودی عرب، یمن، مشرقی افریقہ، جنوبی افریقہ، بھارت اور مشرقی پاکستان کے سفروں میں بھی حضرت والد صاحبؒ کی خدمت و صحبت کی دولت نصیب فرمائی، مگر افسوس کہ سوانح کا یہ حصہ صرف چار دن میں لکھنا پڑا۔ لہٰذا اس دور کے حالات تو بہت ہی کم لکھے جا سکے۔ تاہم ماہنامہ البلاغ کے مفتئ اعظم نمبر میں اس دور کے بہت سے حالات پر متعدد اہل قلم نے ماشاء اللہ خاصی تفصیل سے لکھا ہے لہٰذا طوالت کے خوف سے یہ سطور یہیں ختم کرتا ہوں۔

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ براہ کرم حضرت والد ماجدؒ کی بلندئ درجات کے لئے خصوصی دعا فرمائیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق کامل عطا فرمائے۔ آمین وہو المستعان۔

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

خادم دار العلوم کراچی ۱۵ رجب ۱۳۹۹ھ

یہ تیرے
پُراسرار بندے!
مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ
ادارۃ المعارف کراچی ۱۴